فہرست

جاوید احمد غامدی

دبستان شبلی

حلقہ گرد من زنید اے پیکران آب و گل
آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

رات کے پچھلے پہر اپنی مطالعہ کی میز پر بیٹھا ہوں۔ آلۂ تکییف نے کمرے کی ساری گرمی باہر پھینک دی ہے، لیکن سینے کی آتش پر اس کا زور کیا چلتا، اس کی انگیٹھی برسوں سے سلگ رہی ہے۔ میں نے بارہا چاہا کہ اس کی کچھ چنگاریاں ادھر ادھر بجھی ہوئی راکھ میں بھی ڈال دوں تو شاید قرار آ جائے، لیکن اس سے تپ شعلہ کیا کم ہو جائے گی؟

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نہ گردد زگسستن شرارہ

تاہم آج یہ چنگاریاں خود بے تاب ہیں کہ اس آگ کا پتا دوسروں کو بھی دیں:

می کشد شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما
جوش آتش بود امروز بہ فوارۂ ما

۱۸۵۷ء جہاں ہماری تاریخ کا وہ سال ہے جس میں ہمارے اقبال کا آفتاب اس برصغیر میں غروب ہوا، وہاں ایک دوسرا آفتاب اس سال میں مطلع امت پر طلوع بھی ہوا۔ یہ مولانا شبلی کا سال پیدایش ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول: وہ ہنگامۂ مشرق میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء کے ہنگامۂ مغرب میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ انھی کا دور ہے جس میں مغربی تہذیب سے ہمارا پہلا تعارف ہوا اور اس کے نتیجے میں یہ امت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ ان میں سے ایک گروہ اس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول و مبادی اور اپنے اکابر کی رایوں سے

بالاتر ہوکر براہ راست قرآن وسنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی تہذیب اوراس کے علوم اس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھیریں۔ اس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیوبندی، انور شاہ کاشمیری، حسین احمد مدنی، اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جن کے نزدیک حق و باطل کا معیار یہی تہذیب اوراس کے علوم قرار پائے۔ ان کا سرخیل وہی بڈھا تھا جس کے بارے میں خود شبلی نے کہا تھا:

پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسم

شبلی ان دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت کے بانی ہوئے۔ اس جماعت کے بنیادی اصول دو تھے: ایک یہ کہ ہمارے لیے ترقی یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اس دور میں پہنچ جائیں جب قرآن اتر رہا تھا اور جب خدا کا آخری پیغمبر خود انسانوں سے مخاطب تھا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ خود قدیم کی ضرورت ہے کہ ہم جدید سے بھی اسی طرح آشنا رہیں، جس طرح قدیم سے ہماری شناسائی ہے۔ سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی، حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، یہ سب اسی جماعت کے اکابر ہیں۔ میں اسے ''دبستان شبلی'' کہتا ہوں۔ اقبال بھی زیادہ تر اسی دبستان سے متعلق رہے۔ ان کی آواز اس عہد کی خوب صورت ترین آواز تھی۔ ان کی شاعری ادب عالیہ قرار پائی۔ تاہم فلسفہ وتصوف سے دل چسپی کی وجہ سے ان کا معاملہ وہی رہا جو اس سے پہلے ہم اپنی تاریخ میں مثلاً غزالی کے ہاں دیکھ چکے تھے۔ وہ جس غزال رعنا کے اسیر ہوئے، اس پر چلانے کے لیے تیر کمان میں رکھتے ہیں، پھر اسے دیکھتے ہیں تو یہی تیر کسی اور کے سینے میں ترازو ہو جاتا ہے۔ گویا وہی معاملہ ہے:

خدنگ جعبۂ توفیق امشب در کمانم بود
غزالم درنظر بسیار خوب آمد خطا کردم

سید سلیمان ندوی اگرچہ شبلی کے جانشین ہوئے، لیکن حق یہ ہے کہ وہ پہلے گروہ ہی سے متعلق تھے۔ چنانچہ انھوں نے عملاً اس حقیقت کو اس طرح ثابت کیا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی بیعت کر لی۔ عبدالماجد دریابادی کے بارے میں بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید اسی جماعت کے فرد تھے، لیکن ان کی داستان حیات یہی ہے کہ دانش گاہ الحاد سے نکلے اور سیدھے تھانہ بھون کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ ابوالکلام اس دور کے عبقری تھے، ان کی تحریر وخطابت نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ وہ آئے تو لگتا تھا کہ صحراؤں کی وسعتیں سمٹ گئیں اور دریاؤں کا زور ان کے سامنے ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن ان

کے علم وعمل کی ناقہ خود اپنے ہی غبار میں گم ہوگئی۔ ابوالاعلیٰ عالم بھی تھے اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ ان کے حسن طبیعت میں حسن فطرت کی جھلک تھی۔ وہ ان کے بعد اس شان سے اس راہ پر چلے کہ ہر شخص نے یہی خیال کیا کہ اب منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت آگے گئے، لیکن پھر بھی کتنا پیچھے رہ گئے، اس کا اندازہ کوئی شخص اگر کرنا چاہے تو مثال کے طور پر قرآن مجید کی آیت: 'فقد صغت قلوبکما' کے بارے میں فراہی کی تحقیق اور ان کی تفسیر کو ایک نظر دیکھ لے۔ میں نے آخری عمر میں انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پاس ادب مانع رہا، ورنہ بارہا جی چاہا کہ ان کی خدمت میں عرض کروں:

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی

اس دبستان میں جس شخص کو امام العصر کہنا چاہیے، وہ تنہا حمید الدین فراہی ہیں۔ وہ اس زمین پر خدا کی آیات میں سے ایک آیت تھے۔ سید سلیمان ندوی سے سنیے، وہ ان کی وفات پر لکھتے ہیں:

''الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصرو شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصروشام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ (۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ) کو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وہ جس کے فضل وکمال کی مثال آیندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ جس کی مشرقی ومغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہدوورع کی تصویر، فضل وکمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفرد، لیکن ایک جہان دانش۔ ایک دنیاے معرفت، ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا داناے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے ردوقبول اور عالم کی داد وتحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ۔ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم وتدبر اور درس وتعلیم میں محو، ہر شے سے بے گانہ اور شغل سے ناآشنا تھی۔ افسوس کہ ان کا علم ان کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہوسکا۔ مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اس کے چھپنے اور ربط ونظام دینے کا دماغ اب کہاں۔ جو چند رسالے چھپے، وہ عربی میں ہیں، جن کے عوام کیا، علما تک ناقدر شناس ہیں۔ ان کی زندگی ہمارے لیے سرمایۂ اعتماد تھی اور ان کا وجود دارالمصنفین کے لیے سہارا تھا۔ افسوس کہ یہ اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا جس کے سوا کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں۔ اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی، لیکن دنیا ان کی

قدرومنزلت کو نہ پہچان سکی اوران کے فضل وکمال کی معرفت سے نا آشنا رہی:

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
بازپس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ‘‘

یہ شرف تنہا اسی ہستی کو حاصل ہوا کہ اس نے سفر شروع کیا تو پھر راہ نہیں چھوڑی۔ چنانچہ اس راہ کے مسافروں میں منزل بھی تنہا اسے ہی ملی۔ امین احسن اصلاحی اسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں۔ وہ اپنے استاد سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ حمیدالدین جس مقام پر پہنچے تھے، ان کی ساری عمر اسی کے اسرار و رموز کی وضاحت میں گزری ہے۔ ان کی ’’تدبر قرآن‘‘ تفسیر کی کتابوں میں ایک بے مثال شہ پارۂ علم و تحقیق ہے۔ ان کے قلم سے پچاس برس کے معرکوں کی روداد سنیے تو بقول عرفی:

رح او گوید اگر جنگ و گر صلح کہ من
بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقاں رفتم

وہ عمر بھر جن لوگوں میں رہے، ان میں کم ہی اس کے اہل تھے کہ ان کے فضل و کمال کو پہچانتے۔ میں نے ان کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بارہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بدرخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

اب اس وقت دیکھیے، پہلے گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔ اس کی مثال اب اس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی۔ دوسرا گروہ، اگرچہ ابھی شرف و اقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کیے ہوئے ہے، لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ پرانی ضلالتوں کی طرح یہ ضلالت بھی کچھ عرصے کے بعد اس کے صفحات ہی میں باقی رہ جائے گی۔ آنے والے دور کی امامت ’’دبستان شبلی‘‘ ہی کے لیے مقدر ہے۔ تاریخ کے مرسح پر اب پس پردہ اسی کے ظہور کی تیاری ہو رہی ہے۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

لیکن یہ خود کس حال میں ہے؟

سید سلیمان ندوی کے خلف ابوالحسن علی ہیں۔ مگر وہ انھی کی طرح اب ندوہ سے زیادہ دیو بند میں ہیں۔ ابوالکلام اس دنیا سے تنہا رخصت ہوئے۔ ابوالاعلیٰ نے جو لوگ اپنے پیچھے چھوڑے، ان میں وہ بھی ہیں جو ان کے جانشین

ہوئے اور وہ بھی جن کا دعویٰ ہے کہ وہ انھی کی جانشینی میں لوگوں سے سمع وطاعت کی بیعت لے رہے ہیں۔ ابوالاعلیٰ کی میراث میں سے بہت سی چیزیں ان دونوں کو ملیں، مگر ان کے علم وادب اور حسن طبیعت سے کوئی حصہ، افسوس ہے کہ انھیں نہیں مل سکا۔ چنانچہ ان بے چاروں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ اسی پہلے گروہ کے دروازے پر ہاتھ پھیلائیں اور بار بار دھتکارے جائیں۔ یہاں تک کہ ''دبستان شبلی'' کی ہر 'غلطی' کا کفارہ بھر دیں۔ اس جماعت میں بے شک، ان کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ وہ کچھ پڑھے لکھے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی حیثیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ابوالاعلیٰ ہی کے متن کی شرح ہیں۔ عرفی نے صدیوں پہلے شاید انھی کے لیے کہا تھا:

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو

کہ درمیانہ گزینی سراب و تشنہ لبی ست

''دبستان شبلی'' کی آخری نشانی اب امین احسن ہی ہیں۔ ان کے تلامذہ واحباب میں کتنے ہیں جو اس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے اسی احساس کی آگ ہے جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اس کی چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں دب جاتی ہیں، مگر بجھنے نہیں پاتیں:

کہ آتشے کہ نہ میرد ہمیشہ در دل ماست

کبھی جی چاہتا ہے کہ ابوالاعلیٰ کے جانشینوں سے کہوں:

دست ہر نااہل بیمارت کند

سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

کبھی خیال آتا ہے کہ امین احسن کے حلقۂ سخن سے عرض کروں:

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگذارم

با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

دیکھیے، قلم کی سیاہی خشک ہوگئی۔ یہ حادثہ میرے ساتھ پہلی بار نہیں ہوا۔ میں نے جب بھی یہ داستان سنانی شروع کی، یہیں پہنچ کر ختم ہوگئی۔ کبھی لفظ جواب دے گئے، کبھی رشتۂ معنی میں گانٹھ پڑ گئی، کبھی سننے والے سو گئے، اور آج ــــــ قلم ایں جا رسید سر بشکست۔ یہ شاید، میرے لیے اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ:

سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت

[۱۹۸۷ء]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ النساء

(۲۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ، وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی، یُرَآءُ وْنَ النَّاسَ، وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ،

یہ منافق خدا سے دھوکا کرنا چاہتے ہیں، دراں حالیکہ اُسی نے اِنھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ (تم اِنھیں دیکھتے ہو) یہ جب نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو جی ہارے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کے لیے اُٹھتے ہیں۔ یہ خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر ہیں[219]۔

---

[۲۱۹] یعنی نہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں نہ اُن منکروں کے ساتھ جن کی وکالت کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس ہوتے ہیں تو اُنھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ہیں اور منکروں سے ملتے ہیں تو اُنھیں یقین دلاتے ہیں کہ اُن کے ساتھ ہیں، حالاں کہ دل سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ قرآن نے اِن کے لیے 'کُسَالٰی'، 'یُرَآءُ وْنَ' اور 'مُذَبْذَبِیْنَ'، کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ تینوں حال واقع ہوئے ہیں۔ اِن کی حالت کا پورا نقشہ، اگر غور کیجیے تو اِن سے آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین صرف اللہ کے بندوں ہی کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں، بلکہ خدا کو بھی دھوکا دینا

لَآ اِلٰی هٰٓـؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓـؤُلَآءِ، وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ﴿١٤٣﴾
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ، اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿١٤٤﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ، وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ﴿١٤٥﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ، وَسَوْفَ یُؤْتِ اللّٰهُ

(اِن کے جرائم کی پاداش میں اِنھیں اللہ نے گمراہی میں ڈال دیا ہے) اور جسے اللہ گمراہ کر دے، اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ ١٤٢-١٤٣

ایمان والو، (اِن کی باتوں میں آ کر) تم مسلمانوں کو چھوڑ کر (پیغمبر کے) منکروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو۔ (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ) یہ منافق دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوں گے اور تم اِن کے لیے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ ہاں، جو توبہ کریں گے اور (اپنے طرزِ عمل کی) اصلاح کر لیں گے اور اللہ کو مضبوط پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیں گے،[٢٢٠] وہ مومنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مومنوں کو عنقریب اجرِ عظیم عطا

چاہتے ہیں، حالاں کہ جو خدا کو دھوکا دینا چاہتا ہے، وہ خدا کو دھوکا نہیں دیتا، بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے، اِس لیے کہ خدا اُس کی رسی دراز کر دیتا ہے جس سے وہ سمجھتا ہے کہ اُس نے خدا کو دھوکا دے دیا ہے، حالاں کہ دھوکا اُس نے خدا سے کھایا۔ 'وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوةِ'، یہ اِن کی اِس دھوکا بازی کی مثال ہے، یعنی نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکسائے ہوئے، مارے باندھے محض اِس ڈر سے اُٹھتے ہیں کہ اگر شریک جماعت نہ ہوئے تو مسلمانوں کے رجسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان اِن کو اپنے اندر شامل سمجھیں، اس وجہ سے اِس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے، جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکا بازی ہے۔ فرمایا: یہ خدا کے راندے ہوئے ہیں، اُس نے اِن کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہے اور جن کو خدا نے بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا ہو، اب اُن کو راہ پر کون لا سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ٢/٤١١)

الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿١٤٦﴾

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ، وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿١٤٧﴾

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ، وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿١٤٨﴾

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ، فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿١٤٩﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ، وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ،
وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ، وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿١٥٠﴾

فرمائے گا۔۱۴۴-۱۴۶

(خدا کے بندو)، اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور سچے مومن بن کر رہو[۲۲۱] تو اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں عذاب دے۔ اللہ تو بڑا قبول کرنے والا اور (ہر چیز کا) جاننے والا ہے[۲۲۲]۔ ۱۴۷

(ایمان والو، یہ منافق تم پر زیادتی کریں اور تم جواب دینا چاہو تو دے سکتے ہو، اِس لیے کہ) اللہ مظلوم کے سوا کسی کا بُری بات کہنا پسند نہیں کرتا اور اللہ سمیع و علیم ہے[۲۲۳]۔ (لیکن اِس کے بجائے) اگر ظاہر و باطن میں نیکی ہی کیے جاؤ گے یا (کم سے کم) برائی سے درگزر کرو گے (تو یہی بہتر ہے)، اِس لیے کہ اللہ (کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ) معاف کرنے والا ہے، (اِس کے باوجود کہ) بڑی قدرت رکھنے والا ہے۔ ۱۴۸-۱۴۹

(یہ حقیقت، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ) جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کے منکر ہو رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اُس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ کسی کو مانیں گے اور کسی

---

[۲۲۰] اصل میں 'اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'دین' کا لفظ اطاعت کے معنی میں ہے۔ سورۂ زمر (۳۹) کی آیت ۱۱ میں بھی یہ اِسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

[۲۲۱] اس آیت میں، اگر غور کیجیے تو شکر ایمان پر مقدم ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ فلسفۂ دین کے لحاظ سے شکر ہی سچے ایمان کا سرچشمہ ہے۔

اُولٰٓـئِكَ هُـمُ الْـكٰفِرُوْنَ حَقًّا، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَـنُـوْا بِـالـلّٰهِ وَرُسُلِهٖ، وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ، اُولٰٓـئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ، وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

کونہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ ایمان اور کفر کے بیچ میں کوئی راہ نکالیں، وہ پکے منکر ہیں اور ہم نے اِن منکروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (اِس کے برخلاف) جو اللہ اور اُس کے رسولوں کو مان رہے ہیں اور اُن میں سے کسی کے درمیان اُنھوں نے کوئی تفریق نہیں کی ہے، اُن کو اللہ ضرور اُن کا اجر عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۵۰-۱۵۲

---

[۲۲۲] اِس لیے اگر صحیح رویہ اختیار کرو گے تو وہ اُس کی قدر کرے گا اور تمھاری توقعات سے بڑھ کر اُس کا صلہ دے گا۔ وہ ہر شخص کے ایمان و عمل سے واقف ہے، لہٰذا تمھارا یہ رویہ بھی اُس سے چھپا نہ رہے گا۔

[۲۲۳] مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہو گے یا کرو گے، اُس کے بارے میں متنبہ رہو، اِس لیے کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

[باقی]

طالب محسن

ایمان اہل حجاز میں

جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غِلَظُ الْقُلُوبِ وَالْجَفَاءُ فِي الْمَشْرِقِ وَالْإِيمَانُ فِي أَهْلِ الْحِجَازِ.

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دل کی سختی اور جفا مشرق میں ہے اور ایمان اہل حجاز میں ہے۔

لغوی مباحث

'غِلَظُ الْقُلُوبِ': دلوں کی سختی۔ ہم اس سے پہلے والی حدیث کی شرح میں اس لفظ کی وضاحت میں لکھ چکے ہیں کہ لفظ 'غلظة' 'رقة' (باریکی) کے متضاد کے طور پر آتا ہے۔ لیکن یہ معنوی پہلو سے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس صورت میں اس کے معنی سخت مزاجی کے ہیں۔ مثلاً سورۂ توبہ (۹: ۱۲۳) میں ہے: 'يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً' (اے ایمان والو، تمھارے گردوپیش میں جو کفار ہیں، ان سے لڑو اور چاہیے کہ وہ تمھارے رویے میں سختی محسوس کریں)۔

'اَلْجَفَاءُ': سختی، جور اور ظلم۔ 'غِلَظُ الْقُلُوبِ' کے ساتھ جفا کا لفظ ظاہری اور باطنی رویے کی یکسانی کو واضح کرنے کے لیے آیا ہے۔

'اَهْلِ الْمَشْرِقِ': اہل مشرق سے وہ قبائل مراد ہیں جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی شدید مخالفت کی تھی۔

پچھلی روایت میں ربیعہ اور مضر قبائل کا ذکر اسی ضمن میں ہوا تھا۔ یہاں اس روایت میں ان قبائل کا نام لینے کے بجائے ان کے علاقے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس روایت کے بعض متون میں ان ناموں کی تصریح بھی ہے۔

'اَھْلِ الْحِجَازِ': حجاز سے وہ علاقہ مراد ہے جس میں مکہ، مدینہ اور طائف کے شہر موجود ہیں۔ حجاز کے لفظی معنی ''روک'' کے ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اسے حجاز اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ علاقہ نجد اور تہامہ کے درمیان آڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل حجاز سے مکہ، مدینہ اور طائف کے رہنے والے مراد ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مرکز کی حیثیت انھی شہروں کو حاصل رہی اور انھی میں سے وہ جلیل القدر ہستیاں اسلامی تاریخ کا حصہ بنیں جنھیں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

معنی

یہ روایت اور پچھلی روایت ایک ہی مضمون کی حامل ہیں۔ اس میں اہل یمن کے ایمان کا ذکر ہوا ہے اور اس میں اہل حجاز کے ایمان لانے کی مدح کی گئی ہے۔ ہم نے پچھلی روایت میں واضح کیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ بیانات اپنے زمانے میں دین کی دعوت میں ملنے والی حمایت اور ہونے والی مخالفت کے حوالے سے ہیں۔ یہ کوئی مستقل وصف نہیں ہے جو ان قوموں یا علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ حجاز جہاں سے عظیم المرتبہ ساتھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو میسر آئے، وہیں بوجہل و بولہب جیسے دین کے دشمن بھی موجود رہے جنھوں نے دین کی مخالفت میں کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بہر حال حجاز کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ عالمی سطح کا مرکز توحید ہے۔ اسی کی جلیل القدر ہستیوں نے خلافت راشدہ کا ادارہ وجود پذیر کیا جو ہمیشہ کے لیے اجتماعی عدل اور اجتماعی فلاح کے طالبوں کے لیے آئیڈیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایمان و عمل حقیقت میں کسی علاقے اور قوم کا خاصہ نہیں ہیں، لیکن وہ لوگ بہر حال قابل ستایش ہیں جو اپنے معاشرے کے تعصّبات، نفسیاتی رکاوٹوں اور رسوم و رواج سے بلند ہو کر حق کو محض حق ہونے کی بنیاد پر قبول کرتے اور اپنے جان و مال کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مکہ اور مدینہ نے ایک معتد بہ تعداد ایسے لوگوں کی میسر کی جنھوں نے دین کی خاطر ہر طرح کے مصائب سہے، دین کی مدد کے لیے مال و جان کو نچھاور کیا اور جب عروج اور ترقی حاصل ہوئی تب بھی انھیں سب سے زیادہ فکر آخرت کی تھی۔ کسی علاقے کا یہ وصف اس کو مستحق بنا دیتا ہے کہ اس کا پیغمبر اس کے رہنے والوں کو 'اَلْاِیْمَانُ فِیْ اَھْلِ الْحِجَازِ' کے الفاظ سے تحسین کرے۔

اس روایت میں بھی اہل مشرق کی سخت دلی کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جو بالکل آخری زمانے میں اسلام لایا اور قبل ازیں اس نے قریش مکہ کا اسلام کی مخالفت میں بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بیان اپنے زمانے کی نسبت سے ہے۔ بعدازاں اس کے اہل ایمان نے بھی اسلام کی خدمت میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔

متون

اس روایت کے متون اور پچھلی روایت کے متون کے بعض جملے مشترک ہو گئے ہیں۔ یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ یہ ایک ہی موقع کا کلام ہے یا الگ الگ مواقع پر کہی گئی باتیں ہیں۔ اس روایت کے بعض متون میں اہل مشرق کے لیے 'فِی الْفَدَّادِیْنَ' کی ترکیب بھی استعمال ہوئی ہے۔ اسی طرح 'فِیْ اَهْلِ الْمَشْرِقِ' کے بجائے 'قِبَلَ الْمَشْرِقِ' کی تعبیر بھی اختیار کی گئی ہے۔ مزید براں اہل مشرق کے لیے 'قسوۃ' کا لفظ بھی آیا ہے اور ربیعہ اور مضر کی تصریح بھی ہوئی ہے۔ 'اَهْلِ الْوَبَرِ' اور 'عِنْدَ اُصُوْلِ اَذْنَابِ الْاِبِلِ' کی تعبیریں بھی ان کے لیے ان متون میں آئی ہیں۔

اہل حجاز کے حوالے سے ایمان کے ساتھ سکینت کا لفظ بھی ان متون میں مروی ہے۔ اسی طرح 'فِیْ اَهْلِ الْحِجَازِ' کے بجائے 'فِیْ اَرْضِ الْحِجَازِ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔

کتابیات

مسلم، رقم ۵۳۔ احمد، رقم ۱۴۵۹۸، ۱۴۶۳۵، ۱۴۷۵۷۔ ابن حبان، رقم ۷۲۹۶۔ ابویعلیٰ، رقم ۱۸۹۳، ۱۹۳۵، ۲۳۰۹۔ معجم اوسط، رقم ۸۶۳، ۱۰۷۱۔ ابن ابی شیبہ، رقم ۳۲۴۳۴۔

محمد رفیع مفتی

طلب امارت کی ممانعت اور کفارۂ قسم کی ترغیب

عَنْ[1] عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ لِي النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ إِنْ أُوتِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا وَإِنْ أُوتِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا وَإِذَا حَلَفْتَ عَلٰى يَمِينٍ فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ وَائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ.

عبدالرحمٰن بن سمرہ سے روایت ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عبدالرحمٰن، تم کبھی حکومت کے کسی عہدے کو طلب نہ کرنا، کیونکہ اگر یہ تمھیں مانگنے پر دیا گیا تو تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی) اور اگر یہ مانگے بغیر تمھیں ملا تو اس میں تمھاری مدد کی جائے گی[1] اور جب تم کسی بات پر قسم کھاؤ، پھر اس سے بہتر کوئی بات تمھارے سامنے آ جائے تو تم اپنی قسم کا کفارہ دو اور اس بہتر بات کو اختیار کر لو۔[2]

ترجمے کے حواشی

۱۔ حکومت کے کسی عہدے کو طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حکومت کی حرص کے جذبے سے لوگوں کے

معاملات کی ذمہ داری سنبھالنا چاہتا ہے۔ حکومت کے کسی حریص شخص سے عدل کی توقع نہیں کی جا سکتی، کیونکہ اس میں موجود طلب حکومت کی کمزوری اقتدار میں آنے کے بعد اس کے اقدامات اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتی ہے، یعنی اس میں محض حق کی خاطر ایسا فیصلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی جس کے نتیجے میں اس کا اپنا اقتدار چھن سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے خدا کی اس مدد کی نفی کی گئی ہے جس کے بغیر انسان کوئی خیر پا ہی نہیں سکتا، لیکن اگر کسی شخص میں حرص کا یہ پہلو موجود نہ ہو، بلکہ اس کی جگہ خیر کا کوئی جذبہ کارفرما ہو تو اس کے لیے طلب حکومت میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ ہے کہ جب ان کے سامنے مصر کے بادشاہ نے اپنی حکومت کا بڑے سے بڑا عہدہ پیش کیا تو انھوں نے مصریوں کی ضرورت اور اپنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اپنے لیے 'اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ'، ''مجھے ملک کے ذرائع آمدن پر مامور کر دیجیے، میں امانت دار بھی ہوں اور باخبر بھی'' (یوسف ۱۲: ۵۵) کے الفاظ سے حکومت کا ایک بہت بڑا عہدہ طلب کیا۔

۲۔ قسم اپنے عہد پر اللہ کو گواہ ٹھہرانا ہے۔ آدمی جب کوئی قسم کھائے تو اسے چاہیے کہ وہ لازماً اسے پورا کرے۔ لیکن اگر کبھی اس کے سامنے یہ بات آ جائے کہ قسم کو پورا کرنے کی صورت میں وہ اس سے بہتر کسی کام سے یا خیر و تقویٰ کی کسی بات سے محروم رہ جاتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ قسم کو پورا کرنے کے بجائے اس کا کفارہ دے اور اس بہتر کام یا خیر و تقویٰ کے حوالے سے اس بہتر بات ہی کو اختیار کرے۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ بخاری کی روایت رقم ۶۲۴۸ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ مضمون یا اس کے کچھ حصے حسب ذیل ۴۱ مقامات پر نقل ہوئے ہیں۔

نسائی، رقم ۳۷۸۲، ۳۷۸۳، ۳۷۸۴، ۳۷۸۹، ۳۷۹۰، ۳۷۹۱؛ بیہقی، رقم ۱۹۶۲۶، ۱۹۶۵۸، ۱۹۷۳۱، ۱۹۷۳۲، ۱۹۷۳۹، ۱۹۷۴۰، ۱۹۷۴۱، ۱۹۷۴۲، ۱۹۷۴۳، ۱۹۷۴۴، ۱۹۷۴۵، ۲۰۰۳۳، ۲۰۰۳۴؛ ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۳۰۲؛ بخاری، رقم ۶۳۴۳، ۶۷۲۷، ۶۷۲۸؛ ابوداؤد، رقم ۳۲۷۷، ۳۲۷۸؛ مسلم، رقم ۱۶۵۲(۲)؛ ترمذی، رقم ۱۵۲۹؛ دارمی، رقم ۲۳۴۶، ۲۳۴۷؛ احمد بن حنبل، رقم ۲۰۶۳۵، ۲۰۶۳۷، ۲۰۶۴۱، ۲۰۶۴۲، ۲۰۶۴۴، ۲۰۶۴۶، ۲۰۶۴۷، ۲۰۶۴۸؛ ابن حبان، رقم ۴۳۴۸، ۴۴۷۹، ۴۴۸۰۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۸۳ میں 'وَائْتِ' (اور اختیار کرو) کے بجائے 'ثُمَّ ائْتِ' (پھر اختیار کرو)

کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بیہقی، رقم ۱۹۶۵۸ میں 'إِذَا حَلَفْتَ' (جب تم قسم کھاؤ) کے بجائے 'إِذَا آلَيْتَ' (جب تم قسم کھاؤ) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں اور 'فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ وَائْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ' (تو اپنی قسم کا کفارہ دو اور اسے اختیار کرو جو بہتر ہے) کے بجائے 'فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ' (تو اسے اختیار کرو جو بہتر ہے اور اپنی قسم کا کفارہ دو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۳۰۳ میں 'غَيْرَهَا خَيْرًا' (اس کے سوا بہتر کو) کے بجائے 'مَا هُوَ خَيْرٌ' (وہ جو بہتر ہے) کے الفاظ اور 'فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ' (پھر اپنی قسم کا کفارہ دو) کے بجائے 'وَكَفِّرْ يَمِينَكَ' (اور اپنی قسم کا کفارہ دو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً بخاری، رقم ۶۳۴۳ میں 'أُوتِيتَهَا' (تمھیں وہ دی گئی) کے بجائے 'أُعْطِيتَهَا' (تمھیں وہ دی گئی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں اور اس حدیث میں جملوں کی ترتیب 'فَإِنَّكَ إِنْ أُوتِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا وَإِنْ أُوتِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا' (کیونکہ اگر تمھیں یہ مانگنے پر دیا گیا تو تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی) اور اگر وہ مانگے بغیر تمھیں ملا تو اس میں تمھاری مدد کی جائے گی) کے بجائے 'فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا' (کیونکہ اگر مانگے بغیر تمھیں یہ ملا تو اس میں تمھاری مدد کی جائے گی اور اگر یہ مانگنے پر تمھیں دیا گیا تو تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی)) روایت ہوئی ہے۔

بعض روایات مثلاً ترمذی، رقم ۱۵۲۹ میں 'إِنْ أُوتِيتَهَا' (اگر تمھیں وہ دی گئی) کے بجائے 'إِنْ أَتَتْكَ' (اگر وہ تیرے پاس آئی) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ اسی طرح اس میں 'فَكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ' (تو تم اپنی قسم کا کفارہ دو) کے بجائے 'وَلْتُكَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ' (اور چاہیے کہ تم اپنی قسم کا کفارہ دو) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً نسائی، رقم ۳۷۹۰ میں 'الَّذِي هُوَ خَيْرٌ' (جو بہتر ہے) کے بجائے 'الَّذِي هُوَ خَيْرٌ مِنْهَا' (جو اس سے بہتر ہے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً دارمی، رقم ۲۳۴۶ میں 'إِذَا' (جب) کے بجائے 'فَإِذَا' (تو جب) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۰۶۳۷ میں 'مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ' (مانگے بغیر) کے بجائے 'عَنْ غَيْرِ

مَسَأَلَةٍ' (مانگے بغیر) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۰۶۴۱ میں 'وُكِلْتَ إِلَيْهَا' (تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی)) کے بجائے 'أُكِلْتَ إِلَيْهَا' (تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی)) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً احمد بن حنبل، رقم ۲۰۶۴۴ میں 'إِنْ أُوتِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا وَإِنْ أُوتِيتَهَا مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا' (اگر تمھیں یہ مانگنے پر دیا گیا تو تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی) اور اگر یہ مانگے بغیر تمھیں ملا تو اس میں تمھاری مدد کی جائے گی) کے بجائے 'إِنْ تُعْطَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ تُعَنْ عَلَيْهَا وَإِنْ تُعْطَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ تُكَلْ إِلَيْهَا' (اگر یہ مانگے بغیر تمھیں ملا تو اس میں تمھاری مدد کی جائے گی اور اگر یہ تمھیں مانگنے پر دیا گیا تو تم اس کے سپرد کر دیے جاؤ گے (اور تمھاری مدد نہ کی جائے گی)) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً ابن حبان، رقم ۴۳۴۸ میں 'فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا' (پھر اس کے علاوہ بات کو بہتر پائے) کے بجائے 'وَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا' (اور اس کے علاوہ بات کو بہتر پائے) کے الفاظ روایت ہوئے ہیں۔

نسائی، رقم ۳۷۸۲ اور بیہقی، رقم ۱۹۷۴۴ میں یہ حدیث ان الفاظ میں روایت ہوئی ہے:

رُوِيَ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِذَا حَلَفَ أَحَدُكُمْ عَلٰى يَمِينٍ فَرَأَى غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا فَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَمِينِهِ وَلْيَنْظُرِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ فَلْيَأْتِهِ.

''عبدالرحمٰن بن سمرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی جب کسی بات پر قسم کھائے، پھر وہ اس سے مختلف بات کو (اپنے حق میں) بہتر پائے تو اسے چاہیے کہ اپنی قسم کا کفارہ دے اور اس بات کی طرف توجہ کرے جو اس سے بہتر ہے اور پھر اسے اختیار کر لے۔''

ریحان احمد یوسفی

سورۂ نصر ــــ ایک عظیم قرآنی معجزہ

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے بہت سے اہتمام کیے ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور نمایاں سلسلۂ نبوت و رسالت ہے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات ہے، جن کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ تاہم انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اہتمام کیا ہے کہ آپ کی تعلیمات کو قرآن و سنت کی شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے تاکہ جب کبھی کوئی پاکیزہ روح حق کی تلاش میں نکلے تو اسے سورج سے زیادہ روشن اس رہنمائی کو تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئے اور قیامت کے دن تک حق کے سچے طالب، اس آفتاب کی روشنی سے اپنے قلوب کو منور کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کے بعد مزید یہ اہتمام بھی کیا ہے کہ ہر دور میں ایسے اہل علم پیدا کیے جو اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن پاک کی حقانیت کے نئے نئے پہلو اور دلائل لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں عام مسلمانوں کا نہ صرف اپنے دین پر اعتماد بڑھتا ہے، بلکہ انسانیت کے سامنے بھی اسلام کا روشن چہرہ مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔

دور جدید میں یہ خدمت اللہ تعالیٰ نے جن اہل علم سے لی ہے، ان میں امام فراہی اور ان کے تلامذہ کا نام بہت نمایاں ہے۔ ان اہل علم کے تحقیقی کام نے اسلام کی سچائی اور پیغمبر اسلام کی حقانیت کو دور جدید میں بالکل مبرہن کر دیا ہے۔ انھوں نے دین کو دور جدید کے علمی تقاضوں کے معیار پر پیش کرنے کے علاوہ اسلامی تعلیمات پر پیدا ہونے والے ان علمی اور عقلی سوالات کا جواب بھی دیا ہے جو معاندین کی طرف سے اکثر اٹھائے جاتے ہیں۔

ان اہل علم کے کام کے بہت سے پہلوؤں میں سے ایک بنیادی پہلو قرآن کریم پر گہرا غور و فکر ہے، جس کے نتیجے

میں دین اسلام اور قرآن پاک کی صداقت کے متعدد پہلو لوگوں کے سامنے آئے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک کڑی سورۂ نصر کی وہ شرح و وضاحت ہے جس کے نتیجے میں یہ قرآن پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت بن کر سامنے آتی ہے، مگر بعض وجوہات کی بنا پر، جن کا تفصیلی ذکر آگے آرہا ہے، یہ آج کے دن تک حضور کی وفات کا ایک اعلان بنی رہی ہے۔

عام مفسرین کے نزدیک سورۂ نصر کی خصوصیت صرف اتنی ہے کہ یہ قرآن کریم کی نازل ہونے والی آخری سورت ہے جو حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ جہاں تک اس سورت کے مفہوم و مدعا کا تعلق ہے تو اس حوالے سے خاص بات یہی ہے کہ اشارتاً اس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے کی اطلاع دی گئی ہے۔ اس رائے کی بنیاد وہ آثار ہیں جو حدیث کی کتابوں میں صحابہ کرام سے منقول ہیں۔ ان روایات کی تفصیل ''تفسیر ابن کثیر'' میں سورۂ نصر کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

استاذ گرامی جاوید احمد صاحب غامدی نے اس سورت کو ایک بالکل مختلف پس منظر سے دیکھا اور اس کے بعد اس سورت کا وہ مفہوم و مدعا بیان کیا ہے جس کے نتیجے میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا ایک بالکل واضح اور بین ثبوت بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق یہ سورت ایک عظیم پیش گوئی کا بیان ہے، جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی دعوت کی قبولیت اور عرب پر غلبے کی تفصیل سے اس وقت آگاہ کر دیا جب مسلمان مکہ میں مغلوبیت کی حالت میں تھے۔ آنے والے برسوں میں دنیا نے دیکھا اور تاریخ نے اس کو ایک حقیقت کے طور پر محفوظ کر لیا کہ یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور ایک ایک کر کے وہ سارے واقعات ظہور پذیر ہوتے چلے گئے جن کا اس سورت میں ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ''اللہ کی مدد اور وہ فتح جب آجائے، (اے پیغمبر، جس کا وعدہ ہم نے تم سے کیا ہے)، اور تم لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھ لو تو اپنے پروردگار کی تسبیح کرو، اُس کی حمد کے ساتھ، اور اُس سے معافی چاہو۔ (اس لیے کہ) وہ بڑا ہی معاف کرنے والا ہے۔'' (النصر ۱۱۰: ۱-۳)

استاذ گرامی کے نزدیک اس سورت کا اسلوب اور قرآن کریم میں اس کا مقام اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ سورت جن واقعات کو بیان کرتی ہے، وہ ماضی کی داستان نہیں، بلکہ اس غلبے کی اہم ترین منازل کا بیان ہے جو آنے والے دنوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مقدر کر دیا تھا۔ ذیل میں ہم ان دونوں دلائل، یعنی سورت کا اسلوب اور قرآن میں اس کا مقام، دونوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر رہے ہیں۔

پہلے اس سورت کے اسلوب کو لیجیے۔ جیسا کہ اردو ترجمے سے ظاہر ہے، اس سورت میں مستقبل کے کچھ واقعات کی خبر دی گئی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب یہ واقعات ظہور پذیر ہو جائیں تو تم اپنے رب کے نام کی تسبیح اس کی تعریف کے ساتھ کرنا اور اس کے حضور استغفار کرنا۔ استاذ گرامی کا کیا ہوا ترجمہ عربی زبان و بیان کے مسلمہ اسالیب کے مطابق ہے۔ یہ عربی زبان کا عام اسلوب ہے کہ حرف 'اذا' ماضی کے ساتھ آ کر شرط اور مستقبل کے معنی دیتا ہے۔ اس سورت میں جن متعین واقعات کے ساتھ یہ اسلوب استعمال ہوا ہے، وہاں تو اس بات کی کوئی گنجایش ہی نہیں کہ ماضی یا حال کے کوئی معنی نکالے جائیں۔ اسی بات کو امام اللغہ زمخشری نے اس طرح بیان کیا ہے:

(اِذَا جَآءَ) منصوب بسبح، و هو لما يستقبل. والاعلام بذلك قبل كونه من اعلام النبوة. (الكشاف ۸۱۰/۴)

''(اِذَا جَآءَ) 'سَبِّحْ' سے منصوب ہے اور یہ مستقبل کے لیے استعمال ہوا ہے۔ مستقبل کے رونما ہونے سے پہلے اس کی خبر دینا نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔''

دیگر مترجمین جو زبان کی رعایت سے ترجمہ کرتے ہیں، ان کا ترجمہ بھی جاوید صاحب کے ترجمے سے مختلف نہیں، مگر جب تفسیر کا موقع آتا ہے تو روایت کی بنیاد پر وہ اس سورت کو قرآن کی آخری سورت قرار دے دیتے ہیں، جس کا کم سے کم نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سورت میں کوئی پیش گوئی باقی نہیں رہتی۔ جبکہ غور و فکر کرنے والے اذہان میں ایک سوال فوراً پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ جب سورت میں بیان کردہ واقعات پہلے ہی رونما ہو چکے تو مستقبل کے اسلوب میں ان کو بیان کرنے کے کیا معنی؟ مزید یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی اس ہدایت کا کیا مطلب کہ جب یہ ہو جائے تو پھر ہماری تسبیح کرنا؟ اس لیے کہ سب کچھ تو پہلے ہی ہو گیا۔

اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ اگر آج کوئی یہ کہے کہ جب پاکستان بن جائے تو لوگوں کو اس کی تعمیر و ترقی کے لیے کام کرنا چاہیے تو یہ درست انداز بیان نہیں ہوگا۔ پاکستان بننے سے پہلے اگر کسی نے یہ بات کہی ہے تو ٹھیک ہے۔ اس زمانے کا کوئی قول اگر آج نقل کیا جائے تو یہ بھی غلط نہیں، لیکن پاکستان بننے کے بعد اس اسلوب میں پاکستان کی ترقی کے لیے کام کرنے کا مشورہ دینا آخر زبان کے کس قاعدے، کس اسلوب کی رو سے درست ہے؟

یہی سبب ہے کہ جن مفسرین کی نظر اس پہلو پر گئی، انھوں نے مذکورہ بالا روایات کے ہوتے ہوئے یہ بات کہی

ہے کہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے ہوا ہے۔ اوپر زمخشری کی بات ہم بیان کر چکے ہیں جبکہ جدید مفسرین میں مفتی شفیع صاحب اور امین احسن اصلاحی صاحب کی یہی رائے ہے۔ مفتی شفیع صاحب لکھتے ہیں:

''اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ سورۃ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے یا بعد میں، لفظ 'اِذَا جَـآءَ' سے بظاہر فتح سے پہلے نازل ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور ''روح المعانی'' میں ''بحر محیط'' سے ایک روایت بھی اس کے موافق نقل کی ہے جس میں اس سورۃ کا نزول غزوۂ خیبر سے لوٹنے کے وقت بیان کیا گیا اور خیبر کی فتح فتح مکہ سے مقدم ہونا معلوم و معروف ہے اور ''روح المعانی'' میں بسند عبد ابن حمید حضرت قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کے نزول کے بعد دو سال زندہ رہے۔'' (معارف القرآن ۸/۸۳۶)

اصلاحی صاحب بھی ''تدبر قرآن'' میں اسی رائے کے قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس سورہ کے زمانۂ نزول سے متعلق دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ فتح مکہ کے بعد نازل ہونے والی سورتوں میں یہ سب سے آخری سورہ ہے۔ دوسرا یہ کہ فتح مکہ سے پہلے اس کی بشارت کے طور پر نازل ہوئی ہے۔ میرے نزدیک اسی دوسرے قول کو ترجیح حاصل ہے۔'' (۹/۶۱۵-۶۱۶)

استاذ گرامی جاوید احمد غامدی صاحب کے نزدیک اس سورت کا زمانۂ نزول ہجرت سے قبل مکہ کا آخری زمانہ ہے، کیونکہ اس سورت میں دو نہیں تین واقعات بیان ہوئے ہیں اور ان میں سے پہلا واقعہ وہ ہے جو فتح مکہ سے بہت قبل ہجرت کے فوراً بعد پیش آیا تھا، یعنی انصار کا قبول اسلام۔ یہ اس بات کی تفصیل ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں مستقبل کے جن واقعات کا بیان ہے، ان میں سے دو تو ایسے ہیں جو دیگر مفسرین بھی تاریخ کی روشنی میں بیان کر دیتے ہیں، یعنی 'الـفـتـح' سے مراد فتح مکہ اور گروہ در گروہ دین میں لوگوں کے داخلے سے فتح مکہ کے بعد کا وہ وقت ہے جب پورے عرب نے اسلام قبول کر لیا تھا اور لوگ قبیلہ در قبیلہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ اسی بنیاد پر وہ اس سورت کا نزول فتح مکہ سے پہلے مانتے ہیں۔ تاہم یہ لوگ اللہ کی نصرت کو کوئی الگ واقعہ خیال نہیں کرتے اور اس کو فتح مکہ کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔

تاہم ہمارے نزدیک یہ بات واضح ہے کہ اس سورت میں 'الـفـتـح' سے قبل مستقل بالذات ایک اور واقعے کی خبر دی گئی ہے، یعنی اللہ کی مدد کے آنے کی اور یہ مدد انصار کا وہ قبول اسلام تھا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو کفار کے ظلم و ستم سے نجات مل گئی اور یثرب کا وہ دار الہجرت میسر ہوا جہاں مسلمانوں کا اقتدار باقاعدہ قائم ہو گیا۔ قرآن پاک میں انصار کو مدد کرنے والے اور مدینہ کی ریاست کو اقتدار کی نصرت خود اللہ تعالیٰ نے قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ. (الانفال ۸:۷۴)

''اور جولوگ ایمان لائے اور وطن سے ہجرت کر گئے اور خدا کی راہ میں لڑائیاں کرتے رہے۔ اور جنھوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور ان کی مدد کی، یہی لوگ سچے مسلمان ہیں، ان کے لیے (خدا کے ہاں) بخشش اور عزت کی روزی ہے۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں ہجرت سے قبل نازل ہونے والی آیات میں فرمایا:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۸۰)

''اور دعا کرو کہ پروردگار، مجھے تو جہاں بھی لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔''

قرآن کریم کی یہ تصریحات واضح کرتی ہیں کہ سورۂ نصر میں اللہ تعالیٰ کی مدد سے مراد یہی انصار کی شکل میں ملنے والی مدد اور مدینہ میں ملنے والا اقتدار ہے۔ تاہم یہاں سوال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں تو کئی مواقع پر اللہ کی مدد کا ذکر ہے، ہم صرف اسی واقعے کو اس سورت کی بیان کردہ خبر کا مصداق کیوں قرار دے رہے ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کفار پر بہت سی فتوحات حاصل ہوئیں، لیکن 'الفتح' کا اطلاق فتح مکہ ہی پر کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ وہ فیصلہ کن فتح تھی جس نے پورے عرب پر غلبے کا راستہ کھول دیا تھا۔ اسی طرح اللہ کی مدد کا ظہور مختلف مواقع پر ہوتا رہا۔ یہ ظہور ہجرت کے راستے میں غار ثور میں بھی ہوا (التوبہ ۹:۴۰)، جنگ بدر (الانفال ۸: ۹-۱۰)، احد (آل عمران ۳:۱۲۴-۱۲۶)، خندق (الاحزاب ۳۳:۹)، صلح حدیبیہ (الفتح ۴۸:۱-۳)، فتح مکہ (الصّف ۶۱:۱۳)، حنین (التوبہ ۹:۲۵) اور پھر آخری دارو گیر کے موقع پر بھی ہوا (التوبہ ۹:۱۴)۔ تاہم انصار مدینہ کا قبول اسلام اور اس کے نتیجے میں امن، اقتدار اور آزادی کا ملنا ہی مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ ہجرت مدینہ کا واقعہ ایک فیصلہ کن واقعہ تھا جس نے حالات کا دھارا موڑ دیا۔ یہ اتنا اہم واقعہ ہے کہ سیدنا عمر کے دور میں ہجری کیلنڈر کا آغاز فتح مکہ یا اعلان نبوت سے نہیں، بلکہ ہجرت سے کیا گیا۔

پھر اس موقع پر اوس و خزرج کے لوگوں کا قبول اسلام اس طرح مہاجرین کی مدد کا سبب بنا کہ تاریخ میں ان کا لقب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انصار پڑ گیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ انصار کا یہ قبول اسلام جن حالات میں ہوا، وہ آخری درجہ کے مایوس کن حالات تھے۔ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندانی تحفظ آپ کے چچا ابو طالب کی وفات کے بعد ختم

ہو چکا تھا۔ مسلمان ظلم وستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ قریش کے خوف سے کوئی قبیلہ مسلمانوں کو تحفظ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ نوبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازشوں تک پہنچ رہی تھی۔ ادھر اوس وخزرج باہمی جنگوں اور افتراق کا شکار تھے۔ ایسے میں اچانک حالات نے پلٹا کھایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں باہمی محبت والفت پیدا کر دی اور ان کے دل اسلام کے لیے کھول دیے۔ ان کا اسلام خدا کی وہ مدد بن کر ظاہر ہوا، جس نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دے دیا جس کی اُس وقت انھیں ضرورت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس احسان کو بہ صراحت اپنی مدد ونصرت کہا ہے:

هُوَ الَّذِيٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ . وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (الانفال ۸: ۶۲-۶۳)

''وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے آپ کی تائید ونصرت کی۔ اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ آپ روے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے، مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑے۔ یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔''

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (الانفال ۸: ۲۶)

''یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، زمین میں تم کو کمزور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمھیں مٹا نہ دیں۔ پھر اللہ نے تمھیں جاے پناہ مہیا کر دی اور اپنی مدد سے تمھیں مستحکم کر دیا اور تمھیں پاکیزہ رزق عطا فرمایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔''

قرآن کے یہ صریح بیانات اور تاریخی شواہد یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہیں کہ سورۂ نصر میں جس نصرت الٰہی کی خبر دی گئی تھی، اس کا مصداق ہجرت کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس بات کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس سورت کا نزول ہجرت سے پہلے مانا جائے۔

استاذ گرامی نے سورت کے داخلی بیان کے علاوہ بھی قرآن کریم میں مقرر کی گئی سورتوں کی ترتیب سے اس سورت کا زمانۂ نزول ہجرت سے قبل ہی کا متعین کیا ہے۔ سورتوں کی ترتیب کے اس اصول کی تفصیلات استاذ گرامی نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کی ہے۔ جو لوگ تفصیل کے ساتھ اسے سمجھنا چاہیں، وہ اس کتاب کے باب، ''اصول ومبادی'' میں ''مبادی تدبر قرآن'' کی بحث کے ذیل میں 'سبع مثانی' کے عنوان کے تحت اسے دیکھ سکتے ہیں۔

یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان کا نقطۂ نظر بیان کیے دیتے ہیں۔ اس بات سے سب واقف ہیں کہ حفظ، قراءت اور معنوی اعتبار سے لوگوں نے قرآن پاک کئی طرح سے تقسیم کیا ہے۔ یہ تقسیم سپاروں، منازل اور رکوعات کی شکل میں ہر مصحف میں دیکھی جاسکتی ہے۔ امام فراہی اور ان کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی اور استاذ گرامی جاوید احمد غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق قرآن پاک کا گہرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ قرآن کریم کی سورتیں اللہ تعالیٰ نے الل ٹپ طریقے پر نہیں، بلکہ ایک بامقصد اور حکیمانہ طریقے پر ایک خاص نظام کے تحت جمع کی ہیں جس کے نتیجے میں ایک تقسیم اور ترتیب وجود میں آتی ہے۔ یہ ابواب کی ترتیب ہے۔ ہر باب متصل سورتوں کا مجموعہ ہے، جس میں ایک متعین موضوع زیر بحث آتا ہے۔ اس طرح قرآن پاک معنوی طور پر سات ابواب میں تقسیم ہے۔

ہر باب ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتوں سے شروع ہوکر ایک یا ایک سے زیادہ مدنی سورتوں پر ختم ہوتا ہے۔ کسی باب میں ایسا نہیں ہوتا کہ مکی سورتوں کے بیچ میں کوئی مدنی سورت آجائے یا مدنی سورتوں کے بیچ میں کوئی مکی سورت آجائے۔ قرآن کریم کے تمام ابواب کی طرح آخری باب جو سورۂ ملک سے سورۂ ناس تک ہے، اس میں بھی یہ ترتیب پائی جاتی ہے۔ اس باب میں سورۂ نصر جس مقام پر آئی ہے وہاں اس کے آگے پیچھے مکی سورتیں آتی ہیں۔ کوئی ایسا قرینہ نہیں جس کی بنا پر کسی مدنی سورت کو قرآن کے عام ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، وہاں موجود ہونا چاہیے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر تفصیلی تجزیہ کرکے یہ بتایا کہ سورت کا مضمون یہی گواہی دیتا ہے۔

اس سورت کے ذریعے سے قرآن کی ایک عظیم پیش گوئی سامنے آنے کے علاوہ قرآن کے فہم کا درست طریقہ بھی سامنے آتا ہے۔ جن لوگوں نے چند روایات کو اس سورت کی تفسیر کا معیار بنایا اور سورت کے اپنے مفہوم و مدعا کو بالکل نظر انداز کردیا، ہم بیان کرچکے ہیں کہ ان کے اس عمل کے نتیجے میں ایک انتہائی غیر معمولی سورت کتنی غیر موثر ہوکر رہ گئی۔ یہی امام فراہی اور ان کے تلامذہ کا دین کو سمجھنے کا طریقہ ہے۔ وہ قرآن کریم کے فہم میں اس کی اپنی زبان، اپنے بیان اور اپنے اسلوب کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ پھر اس کی روشنی میں روایات واخبار کا جائزہ لیتے ہیں۔ چنانچہ روایات کا موقع و محل بھی اپنی جگہ بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ جیسے اس سورت سے متعلق آنے والی روایات کو سورت کے اپنے بیان کردہ مفہوم کی روشنی میں جب دیکھا جاتا ہے تو صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ سورت حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے دوبارہ پڑھی۔ یہ گویا اس بات کی یاددہانی اور شکرانے کا ایک اظہار تھا کہ کس طرح تن تنہا اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدے آپ کے ساتھ پورے کیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سعی کے موقع پر جو دعا کی اس میں بھی سورۂ نصر کے الفاظ مستعار لے کر اسی حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے (مسلم، رقم ۱۲۱۸)۔ ان روایات کی جو تاویل ہم کررہے ہیں، کم و

بیش یہی تاویل مفتی شفیع صاحب نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جن روایات میں اس کا نزول فتح مکہ یا حجۃ الوداع میں نازل ہونا بیان کیا گیا ہے، ان کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سورت پڑھی ہوگی جس سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ ابھی نازل ہوئی ہے۔'' (معارف القرآن ۸۳۶/۸)

بہر حال سورت کے اس مفہوم کے سامنے آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک اور ثبوت دنیا کے سامنے آتا ہے۔ کوئی عام مفکر، داعی اور مصلح کتنا ہی ذہین اور گہری نظر رکھنے والا ہو، مستقبل کی اس طرح پیش گوئی نہیں کر سکتا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں کی ہے۔ یہ سورت بلاشبہ اپنے نزول کے وقت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے لیے تسلی و بشارت کا غیر معمولی سامان لیے ہوئے تھی اور آج بھی مسلمانوں کے ایمان کی پختگی کا ایک ذریعہ ہے۔ اس سب سے بڑھ کر آج کے دور میں جب دین کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کرنا ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے، یہ سورت قرآن کا سب سے بڑا معجزہ اور سب سے بڑی پیش گوئی ہے، جسے قرآن پاک کی صداقت کی ایک روشن دلیل کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر خورشید عالم

قاہرہ میں چند روز ـــــ علمی مشاہدات

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

ـــــ ۳ ـــــ

جامع عمرو بن العاص مصر، بلکہ براعظم افریقہ کی پہلی جامع مسجد

حضرت عمرو بن العاص نے رومیوں کے بچے کھچے لشکر کو اسکندریہ میں شکست دینے کے بعد مصر کو آغاز محرم ۲۰ھ (۸ نومبر ۶۴۱ء) میں فتح کر لیا تو انھوں نے نئے دارالحکومت فسطاط کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اس شہر میں کوئی قلعہ تعمیر نہ کیا، کیونکہ اہل مصر اپنی مرضی سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے، اس لیے ان سے دشمنی کا کوئی خوف نہ تھا۔ سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے والیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ فتح کے بعد سب سے پہلے جامع مسجد تعمیر کی جائے۔ اسی حکم کے تحت بصرہ، کوفہ، فسطاط اور شام کی جامع مسجدوں کی بنیاد رکھی گئی۔ ۲۱ھ (۶۴۲ء) یعنی قاہرہ کی بنیاد سے تین سو سال پہلے جامع مسجد عمرو بن العاص کی بنیاد رکھی گئی۔

فسطاط کے عین درمیان قیسیہ بن کلثوم کا باغ تھا۔ حضرت عمر نے باغ کی قیمت پیش کی، مگر قیسیہ نے معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور اپنی زمین بلا معاوضہ دے دی۔ اس جگہ کے شمال مغرب میں دریاے نیل آب و تاب سے بہ رہا ہے۔ چار صحابہ یعنی حضرت ابوذر غفاری، ابوبصرہ، محمیۃ بن جزء زبیدی اور نبیہ بن صواب بصری نے اس کی تعمیر کی نگرانی کی۔ ۸۰ کے قریب صحابۂ کرام نے قبلہ کی حد بندی میں حصہ لیا۔ ان میں ربیعہ بن شرجیل، عمرو بن علقمہ قرشی، زبیر بن العوام،

مقداد بن اسود، عبادہ بن صامت، رافع بن مالک، ابوالدرداء فضالہ بن عبیداللہ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ شامل تھے۔

ابتدا میں اس مسجد کا طول ۳۸.۹ میٹر اور عرض ۳۴.۷۱ میٹر یعنی کل رقبہ تقریباً ۵۷۶ میٹر تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی توسیع ہوتی گئی، اس کے چھ دروازے تھے۔ دو دروازے مشرق کی جانب حضرت عمرو بن العاص کے گھر کے سامنے، دو دروازے شمال کی جانب اور دو دروازے مغرب کی جانب۔ چھت نیچی تھی جو کھجور کی شاخوں اور گارے سے بنائی گئی تھی اور کھجور کے تنوں پر کھڑی تھی۔ دیواریں مٹی، گارے اور اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں، مسجد کا کوئی صحن نہ تھا۔ موسم گرما میں مسجد کے اندر کا درجۂ حرارت شدید ہوتا تھا۔ زمین پر کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔ وضو کے لیے ایک کنواں تھا جو ''البستان'' کے نام سے مشہور تھا۔ جب حضرت عمرو بن العاص نے منبر بنایا تو امیر المومنین عمر بن الخطاب نے ان کو خط لکھا: ''کیا یہی کافی نہیں کہ تم کھڑے ہو اور مسلمان تمھارے قدموں میں بیٹھے ہوں''۔ حضرت عمرو بن العاص نے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے منبر ہٹا دیا۔ مسجد میں کوئی مینار نہ تھا اور نہ ہی اندر اور باہر کوئی آرایش۔ محراب سپاٹ تھا نہ کہ خول دار۔

وقت کے ساتھ ساتھ مسجد کا رقبہ بڑھتا رہا۔ مسجد سات بار گری اور سات بار بنی۔ ۶۵۳۰ء تک مسجد میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ عہد اموی میں معاویہ بن ابی سفیان، عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں مسجد میں اضافے ہوئے۔ عہد عباسی میں خلیفہ ہارون الرشید اور مامون کے زمانے میں اضافے ہوئے۔ خلیفہ مامون کے زمانہ میں عبداللہ بن عامر نے قابل قدر اضافہ کیا۔ ۲۷۵ھ (۸۸۸ء) میں مسجد کو آگ لگ گئی۔ احمد بن طولون کے بیٹے خارویہ نے اس کی تجدید کا حکم دیا۔ فاطمیوں کے زمانہ میں اگرچہ جامع ازہر کا اہتمام زیادہ کیا گیا، مگر جامع عمرو بن العاص کو نظر انداز نہ کیا گیا۔ خلیفہ العزیز باللہ، خلیفہ الحاکم بامر اللہ اور خلیفہ المستنصر کے زمانہ میں مسجد میں فوارے، لکڑی کے ستونوں کے بجائے سنگ مرمر کے ستون، برآمدے اور مینار بنوائے گئے۔ ۴۳۸ھ میں خلیفہ المستنصر کے حکم سے قبلہ کے دو ستونوں پر چاندی چڑھائی گئی اور اوپر والے حصہ کو چاندی کے ٹکڑے سے مزین کیا گیا جس پر بڑے حروف میں خلیفہ عمر بن الخطاب کا نام کندہ تھا۔

۵۶۴ھ میں فسطاط میں جو آگ لگی، اس میں مسجد بھی برباد ہو گئی۔ ۵۴ دن تک مسجد میں آگ لگی رہی۔ دیواروں کے سوا کچھ نہ بچا۔ ۵۶۸ھ میں صلاح الدین ایوبی نے قبلہ اور محراب کی از سر نو تعمیر کی۔ فرش پر سنگ مرمر لگوایا۔ اور جب انھوں نے شیعی مسلک کے خاتمہ کے لیے جامع ازہر میں نماز اور درس و تدریس کا سلسلہ معطل کیا تو انھوں نے

مصر میں سنی مسلک کی دوبارہ ترویج کے لیے جامع عمرو بن العاص میں خاص دل چسپی لی اور وہاں درس وتدریس کے حلقے قائم کیے۔

ممالیک کے عہد میں سلطان عزالدین ایبک، ظاہر بیبرس اور منصور قلادون نے خوب صورت اضافے کیے۔ محمد بن قلادون کے زمانہ (۷۰۲ھ) میں زلزلہ کی وجہ سے مسجد کو کافی نقصان پہنچا تو سلطان نے منہدم حصوں کو اصل کی مانند از سرنو بنوایا۔ سلطان قایتبائی نے ۸۷۶ھ میں دیواروں اور چھت کی مرمت کرائی۔

عثمانی عہد میں مراد بن محمد نے مسجد کو گرانے کا حکم دیا، کیونکہ اس کی چھت اور ستون گر چکے تھے اور اس کے ہال کا مغربی حصہ ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ اس نے مسجد کو از سرنو تعمیر کیا اور دو مینار بنائے جو ابھی تک قائم ہیں۔ چھتوں پر سنگ مرمر لگوایا اور فرش پر قالین بچھائے۔ اس مسجد کے خدوخال اپنی اصل حالت سے بالکل تبدیل ہو گئے۔ مرمت کے بعد مسجد کا افتتاح اس طرح کیا گیا کہ رمضان ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں الجمعۃ الیتیمہ (آخری جمعہ) وہاں پڑھا گیا، اس موقع پر چار تاسیسی تختیاں نصب کی گئیں جو تا حال باقی ہیں۔ مسجد میں رمضان کا آخری جمعہ ادا کر کے مراد بک نے اس رسم کو زندہ کیا جو فاطمیوں کے عہد میں قائم ہوئی تھی۔ فرانسیسیوں کے دخول سے مسجد برباد ہو گئی۔ انھوں نے اس کی سب قیمتی چیزیں لوٹ لیں۔ محمد علی پاشا نے کچھ اصلاحات کیں اور رمضان کے آخری جمعہ کی رسم کو جاری رکھا۔ خدیو توفیق کے زمانہ میں ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں مسجد کی مرمت کی گئی۔ ملوکیت کے زمانہ میں تھوڑی بہت مرمت صرف اس وقت ہوتی تھی جب بادشاہ اور وزیر اعظم آخری جمعہ کی ادائیگی کے لیے اس مسجد میں آتے تھے۔ جمہوری دور میں حالت بد سے بدتر ہو گئی، کیونکہ اس مسجد میں رمضان کا آخری جمعہ پڑھنے کی روایت بھی ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ فضیلۃ الشیخ محمد غزالی ۱۹۷۱ء میں اس مسجد کے خطیب بنے۔ ان کی کاوشوں سے قاہرہ کے گورنر حمدی عاشور نے مسجد کو جانے والے راستہ کو پختہ کیا اور ایک فوارہ لگوایا۔ پرانے مراد بک کے زمانہ کے منبر کے بجائے نیا منبر بنوایا۔ صدر محمد انوار السادات کے زمانہ میں تین نئے ہال بنے۔ گرنے والے مرمری ستونوں کی جگہ کنکریٹ کے ستون بنائے گئے اور صرف ایوان قبلہ میں مرمری ستون باقی رہے۔ اسی طرح وضو کے لیے موجود کنویں کو پاٹ کر ٹونٹیاں لگوائی گئیں۔ مسجد میں صوتی نظام نصب کیا گیا۔ شیشے کے فانوس لٹکائے گئے جن پر قرآنی آیات لکھی گئیں۔ یہ وہی شیخ محمد الغزالی ہیں جو مدینہ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے جن کو علمی خدمات کی بنیاد پر شاہ فیصل ایوارڈ ملا اور جو اخوان المسلمین کے سرکردہ رہنما تھے۔ جب انھوں نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''السنۃ النبویۃ بین اہل الفقہ واہل الحدیث'' لکھی تو سعودی عرب میں اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی، کیونکہ ان کی رائے میں عورت کے لیے چہرہ ڈھانپنا واجب نہیں اور یہ کہ

عورت کے لیے وزیراعظم بننے میں کوئی شرعی پابندی نہیں۔ یہ کتاب میرے پاس بھی ہے اور ''المورد'' کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

فضیلۃ الشیخ عبدالحمید رضوان کی خطابت کے زمانہ میں صحن کے وسط میں ٹونٹیوں کو ہٹا کر مسجد سے باہر جانب قبلہ وضو کے لیے الگ جگہ بنا دی گئی۔ قبلہ کے ایوان میں غالیچے بچھوا دیے گئے اور پہلی مرتبہ پوری مسجد میں بجلی کے پنکھے لگا دیے گئے۔ ۱۹۸۰ء میں پہلی مرتبہ مسجد میں رمضان شریف کے دوران میں مائدۃ الرحمان (رحمانی دسترخوان) کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالصبور شاہین کے دور خطابت میں مسجد کی تزیین و آرایش کا کام مکمل ہوا تو صدر محمد حسنی مبارک نے ۲۹ رمضان ۱۴۰۶ھ (۶ جون ۱۹۸۶ء) میں آخری جمعہ مسجد میں پڑھا۔ چنانچہ حسنی مبارک جمہوری دور کا پہلا صدر ہے جس نے مسجد کی ترمیم و تجدید کی طرف توجہ دی اور رمضان کا الجمعۃ الیتیمہ (آخری جمعہ) وہاں ادا کیا۔ خواتین کے لیے لکڑی کی سکرین کی جگہ لوہے کی آڑ بنائی گئی۔ وقتاً فوقتاً مخیّر حضرات مسجد کی ترمیم و تجدید میں شریک ہوتے رہے۔ درجن کے قریب لکڑی کی شیلفیں ہیں جن میں عطیہ کے طور پر دی گئی بنیادی کتابیں اور ملک فہد کے پریس کے قرآن حکیم کے نسخے رکھے ہوئے ہیں۔ دیار کی لکڑی کا بنا ہوا بہت بڑا منبر ہے جو خطیب ڈاکٹر عبدالصبور شاہین کے نام سے موسوم ہے۔ وضوخانہ کے قریب جامع مسجد کے قبلہ کے رخ پر تقریبات کے لیے ایک ہال بنا ہوا ہے جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی آرایش اسلامی نقش و نگار اور قرآنی آیات سے کی گئی ہے۔ منبر کے قریب اعلیٰ صوتی نظام کے لیے ایک کمرا ہے جسے صرف جمعہ کے روز یا ماہ رمضان میں کھولا جاتا ہے اور باقی دنوں میں پرانے صوتی نظام سے کام لیا جاتا ہے۔ خواتین کے لیے وضو کی علیحدہ جگہ ہے جو مردوں کے مقام وضو سے دور ہے۔ مسجد کے جنوب کی طرف مسجد کے خدام کے رہنے کے لیے کمرا ہے۔ ڈاکٹر عبدالصبور شاہین کی درخواست پر ملک فہد نے پوری مسجد میں قالین بچھوا دیے۔ ایوان قبلہ کی چھت اور ستونوں کو ادھیڑ کر ان کو از سر نو جوڑا گیا۔ اب ستونوں کی کل تعداد ۳۵۰ ستون ہو گئی ہے۔ طرز تعمیر حرم کی مانند ہے، اسی لیے ستونوں کی اتنی بڑی تعداد ہے۔ لکڑی کی چھت کو دوبارہ جوڑ کر اس کا فرش سنگ مرمر کے بجائے سفید پتھر کا بنا دیا گیا ہے۔ کرسٹل کے ۱۲۰۰ فانوس لٹکائے گئے ہیں۔ مسجد کے صحن کے فرش پر سنگ مرمر لگا دیا گیا ہے۔ اس کے وسط میں بیت المال کے گنبد کی تجدید کر کے اس کے نیچے چھ واٹر کولر رکھ دیے گئے ہیں۔ مسجد کے تین محراب اور بارہ دروازے ہیں۔ بڑے محراب کے ساتھ جنوبی دیوار میں ایک دروازہ خطیب کے آنے جانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ سب مرمتیں اکتوبر ۲۰۰۲ میں مکمل ہوئیں۔

مسجد کی اہمیت

اس مسجد کو عربی مورخین نے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔ مثلاً الجامع العتیق (پرانی جامع مسجد)، تاج الجوامع (سب جامع مسجدوں کا تاج)، مسجد النصر (کامیابی کی مسجد)، مسجد الفتح (فتح کی مسجد)، مسجد اھل الرای الاعظم (عظیم اہل رائے کی مسجد)، قطب سماء الجوامع (جامع مسجدوں کے آسمان کا مدار)۔

تاریخ اسلام میں مسجد نبوی، جامع بصرہ اور جامع کوفہ کے بعد یہ چوتھی جامع مسجد ہے، جبکہ مصر اور براعظم افریقہ میں پہلی جامع مسجد ہے۔ سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور تعلیمی لحاظ سے یہ مسجد مصر میں تاریخ اسلام کی علامت ہے۔ یہ الازہر، زیتونہ اور قیروان کی یونیورسٹیوں سے قدیم تر یونیورسٹی ہے۔ جہاں صحیفۂ صادقہ کے مرتب عبداللہ بن عمرو بن العاص جیسے جلیل القدر صحابی تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی میں امام لیث بن سعد، امام شافعی، سیدہ نفیسہ، ابن حجر عسقلانی، سلطان العلماء عز بن عبدالسلام جیسے علما عربی زبان اور دینی علوم پڑھاتے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جامع عمرو بن العاص قاہرہ میں تہذیب اسلامی کی علامت ہے جس کی پہلی اینٹ ۸۰ کے قریب صحابۂ کرام نے رکھی۔ اس کی بقا فتح مصر سے لے کر اب تک مصر کی تاریخ اور جغرافیہ کی بقا ہے۔

زمانۂ قدیم میں جب بھی دریائے نیل میں سیلاب آتا اور قحط کا خطرہ بڑھ جاتا تو ائمہ، شیوخ، کیتھولک پادری، کاہن، قبطی، یونانی اور یہودی جامع عمرو بن العاص کا رخ کرتے اور ہر گروہ اپنے پیروکاروں کے ساتھ مسجد سے باہر گڑگڑا کر دعائیں کرتا اور آسمانی مدد کا طلب گار ہوتا۔ بڑے نظم وضبط سے اس تقریب کا اہتمام کیا جاتا۔ ہر مذہب دوسرے مذہب کا اس طرح احترام کرتا گویا ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔

اس مسجد کی اہمیت کے پیش نظر اس کے ساتھ مندرجہ ذیل بدعتیں وابستہ ہو گئیں:

مدینہ کا ستون

ایوان قبلہ میں قاری کے چبوترہ کے قریب عمود المدینۃ (مدینہ کے ستون) کے اردگرد ایک پیچ دار لکیر تھی جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہ لکیر امیر المومنین عمر بن الخطاب کے کوڑے کی ضرب کا نشان ہے۔ جب مزدوروں نے اس ستون کو مدینہ سے اٹھا کر فسطاط لانا چاہا تو وہ ان سے اٹھایا نہ گیا، مگر جب عمر بن الخطاب نے اس کو ضرب لگائی تو اس نے حکم مانا اور مزدوروں کے لیے اس کا اٹھانا ممکن ہو گیا۔ مشہور ہو گیا کہ لاعلاج مریض اگر کئی دفعہ اپنی زبان اس ستون پر پھیرے تو شفایاب ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وزارت اوقاف نے اس ستون کے گرد لوہے کا جنگلا لگا دیا تا کہ لوگ ان

خرافات سے رکے رہیں۔ ۱۹۸۶ء کی مرمتوں میں اس جنگلے کو ہٹا دیا گیا اور ستون سے اس پیچ دار لکیر کو بھی مٹا دیا گیا، بعد میں اس ستون کو بھی ہٹا دیا گیا۔

بانجھ پن کا کنواں

ایوان قبلہ میں جنوب مشرق کی طرف ایک کنواں (بئر العقم) ہے جو قدیم زمانے میں وضو بنانے کے کام آتا تھا۔ مرور ایام کے ساتھ یہ کنواں خشک ہو گیا ماسوائے تھوڑے سے پانی کے جو باقی رہ گیا۔ ان پڑھ عورتوں میں مشہور ہو گیا کہ یہ پانی اگر بانجھ عورت کی پیٹھ پر گرا دیا جائے تو بانجھ پن ختم ہو جاتا ہے۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے اس کنویں کو ڈھانپ دیا۔ جب مسجد کے ارد گرد زیر زمین پانی کا پراجیکٹ شروع ہوا تو یہ بچا کھچا پانی بھی سوکھ گیا۔

سیدہ نفیسہ کا محراب

ایوان قبلہ میں شمال مشرق کی جانب آخری آرکیڈ میں چھوٹا سا محراب اینٹوں اور سنگ مرمر سے بنا ہوا تھا۔ یہ قبر کے بالمقابل تھا۔ اس جگہ سیدہ نفیسہ عبادت کیا کرتی تھیں۔ آخری مرمت سے پہلے یہاں عورتیں نماز پڑھا کرتی تھیں اور رمضان کے آخری جمعہ میں ان پڑھ عورتیں اس محراب کو چوما کرتی تھیں۔ آخری مرمت کے بعد اس محراب کو ہٹا دیا گیا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی قبر

مسجد کے اندر ایک قبر ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی بتائی جاتی ہے۔ ''اسد الغابہ'' (۲۲۵/۳) میں لکھا ہے کہ ان کی وفات ۶۳ھ یا ۶۵ھ میں مصر یا مکہ یا طائف میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر ۷۲ یا ۷۳ برس تھی۔ ''الاصابہ'' (۲/ ۳۵۲) میں قطعی طور پر لکھا ہے کہ روایت ہے کہ وہ مصر میں اپنے گھر میں دفن ہوئے۔ آخری عمر میں وہ نابینا ہو گئے تھے۔ یہ بات تو یقینی ہے کہ حضرت عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے کے گھر مسجد کے سامنے تھے۔ بعد میں یہ دونوں گھر مسجد میں شامل کر لیے گئے، اس لیے احتمال یہی ہے کہ یہ قبر عبداللہ بن عمرو بن العاص ہی کی ہو۔ چنانچہ میں نے قبر کے قریب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

''اسد الغابہ'' (۱۱۶/۴) میں حضرت عمرو بن العاص کے بارے میں لکھا ہے کہ صحیح ترین روایت ہے کہ ان کی وفات ۴۳ھ عید الفطر کے روز ہوئی۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ان کو جبل المقطم میں دفن کیا گیا۔

ان کے بعد ان کے بیٹے مصر کے والی ہوئے، مگر امیر معاویہ نے ان کو ہٹا کر اپنے بھائی عتبہ بن ابی سفیان کو والی بنا دیا۔ مسجد کے موقع و محل کے سوا اب اس میں کوئی قدیم چیز باقی نہیں رہی۔

ان مقامات کی سیاحت کے بعد ٹریول ایجنسی والوں نے دریاے نیل کے کنارے واقع ہیپی ڈولفن (Happy Dolphen) ریسٹورنٹ میں کھانا کھلایا۔ کھلا آسمان، نیل کا پرسکون پانی اور لذیذ کھانا۔ خوب مزہ آیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم ہوٹل لوٹ آئے۔

ٹریول ایجنسی کے شیڈول کے مطابق اگلا دن یعنی ۱۲ دسمبر ۲۰۰۶ فارغ تھا، اس لیے اس دن ہم نے پرائیویٹ ٹیکسی لی اور درج ذیل مقامات کی سیاحت کو نکل گئے:

جامع الازہر

یہ قاہرہ کے مشرق میں حی الازہر میں واقع ہے۔ اسے فاطمی خلیفہ معزلدین اللہ کے سپہ سالار جوہر الصقلی نے ۳۶۲ھ (۸۷۳ء) میں یعنی قاہرہ کی بنیاد کے تین برس بعد تعمیر کیا۔ معز کا دعویٰ تھا کہ وہ فاطمۃ الزہرا کی اولاد سے ہے، اس لیے جامع کا نام الازھر رکھا گیا۔ معز کے لیے عزیز باللہ اور اس کے بعد حکم نے اس مسجد میں شان دار لائبریری قائم کی تو وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا جہاں دور دراز سے مسلمان طالب علم دینی علوم پڑھنے آتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ مسجد یونیورسٹی میں تبدیل ہوگئی اور اب یہ یونیورسٹی اسلامی ممالک کی قدیم ترین اور مشہور ترین یونیورسٹی ہے اور ہمارے دینی مدارس کے برعکس یہاں اقتصادیات، تجارت، سائنس، میڈیکل اور انجینئرنگ کے تمام مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ ۷۰۲ھ (۱۳۰۲ء) میں زلزلہ کی وجہ سے یہ جامع ڈھ گئی تو بادشاہ ناصر بن قلادون نے اسے ازسرنو بنایا۔ قایتبائی ابوالنصر نے ۱۴۸۳ء میں اس میں ایک بہت بڑا تالاب اور فوارہ بنایا۔ اس کے بعد بھی خلافت عثمانیہ کے زمانہ میں ۱۵۹۵ء، ۱۷۳۰ء، ۱۷۸۵ء اور ۱۸۵۹ء میں مسجد کی ترمیم و تزیین کا کام ہوتا رہا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۷۹۸ میں فرانسیسی حملہ کے دوران میں ۱۰ ہزار انقلابیوں نے مسجد میں پناہ لی۔ تو جنرل بون (Bon) نے ان کو سڑکوں پر لا کر کچل دیا۔ مسجد میں سوائے ستونوں اور ڈاٹ دار چھتوں کے کچھ باقی نہ رہا۔ بعد کے مرحلوں میں یہ مسجد ٹھوس پتھروں سے بنائی گئی۔ موجودہ عمارت کثیر الاضلاع ہے، اس کے طویل ترین حصہ کی لمبائی ۱۰ میٹر ہے۔ مسجد کے چھ دروازے ہیں۔ مغرب کی جانب سب سے بڑا دروازہ باب المزینین ہے، شمال کی جانب باب الجوہریہ اور مشرق کی جانب باب الشوریہ ہے۔ جنوب کی جانب تین دروازے باب الصعیدیہ (صعید مصر)، باب الشوام (سوریوں کا دروازہ)

اور باب المغاربہ (شمال افریقی دروازہ) ہے۔ مغربی دروازے سے داخل ہوں تو ایک کھلا صحن ہے۔ اس صحن کے اردگرد برآمدے ہیں۔ ان برآمدوں میں کسی زمانہ میں ہر ملک اور ہر رنگ کے طالب علم پڑھا کرتے تھے۔ اگرچہ اب مسجد کے پچھواڑے میں الازہر کے نام سے مستقل یونیورسٹی بن چکی ہے، مگر اب بھی ان برآمدوں میں شیوخ دینی علم پڑھاتے ہیں۔ ایک کمرے میں میں نے ایک استاد کو پڑھاتے دیکھا۔ استاد کھڑا تھا لڑکے آگے قالین پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے لڑکیاں بغیر کسی اوٹ کے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کوئی دس کے قریب لڑکیاں تھیں جن میں سے صرف دو آج کل کے ''شرعی پردے'' میں تھیں یعنی ان کی آنکھیں کھلی تھیں باقی آٹھ کھلے چہرے کے ساتھ مرد طالب علموں کے پیچھے استاد کا لیکچر سن رہی تھیں۔ جب تک علیحدہ یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی مذاہب اربعہ کے استاد پڑھایا کرتے تھے، اس وقت کل اساتذہ کی تعداد ۳۰۸ تھی جن میں ۱۴۵ شافعی مسلک کے، ۹۲ مالکی مسلک کے، ۶۷ حنفی مسلک کے اور ۴ حنبلی مسلک کے تھے۔ جامع ازہرا قامتی درس گاہ تھی۔

صحن کے مشرقی جانب مسجد کا بڑا ہال ہے جو متوازی الاضلاع ہے اور اس کی لمبائی تقریباً ۳۰۰ مربع میٹر ہے۔ اس میں نو قطاروں میں ۱۷۲ استون ہیں۔ کتابوں اور مصاحف کے لیے الماریاں ہیں۔ منبر اپنی سیڑھیوں کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ لکڑی کو کھود کر اس پر گل کاری کی گئی ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ مصر کی قدیم مساجد میں دس دس بارہ بارہ زینوں والے منبر ہیں صرف دو ایک مساجد میں میں نے تین سیڑھیوں والے منبر دیکھے۔ منبر کے سامنے چبوترہ ہے جس پر قراء بیٹھتے ہیں۔ دائیں بائیں ائمۂ اربعہ کے مسلک کے مطابق چار محرابیں ہیں۔

جامع الازہر کی اہمیت

جامع الازہر بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے، یہاں ہر ملک کے مسلمان طلبہ تعلیم حاصل کرنا فخر سمجھتے ہیں۔ جب دمشق اور بغداد کی یونیورسٹیوں کا چراغ گل ہو چکا تھا، جامع الازہر نے علم کی شمع روشن کی۔ یہ جامع اب جامعہ میں تبدیل ہو چکی ہے، جہاں دینی علوم کے پہلو بہ پہلو جدید ترین علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں کے دینی مدارس کے برعکس یہاں عصری تقاضوں کے پیش نظر طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں پر زور دیا جاتا ہے جو فکری ارتقا کا باعث بنتی ہیں۔ ہمارے دینی مدارس میں جدید علوم پر قدغن ہے۔ یہاں تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنے کے بجائے طالب علموں کے ذہنوں پر دقیق معلومات کا بوجھ لاد دیا جاتا ہے جس سے عقل و ذہانت دب جاتی ہے۔ نئے افکار سے شناسائی کے بجائے وہ قدیم اساتذہ کی کتابیں اور ان کے حاشیے پڑھتے اور رٹتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان کا علم جامد اور ذہن پتھر

کی مانند غیر متحرک ہوتا ہے اور وہ وقت کا ساتھ دینے کے بجائے اٹھارہویں صدی کے ماحول میں جیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصری مسائل پر ان کی درس گاہوں سے جاری ہونے والے فتووں اور جامع الازہر سے جاری فتووں میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ الازہر یونیورسٹی کو ہم نے باہر سے دیکھا۔ اندر اس لیے نہ جا سکے کہ وہاں طلبہ کا ہجوم تھا۔ ابھی دو دن پہلے یعنی ۱۰ دسمبر اتوار کو کچھ طلبہ نے جامعہ کے کیمپس میں ہنگامہ کیا تھا، کیونکہ اخبار ''الاہرام'' کے مطابق یونیورسٹی نے آٹھ طلبہ کو غیر پسندیدہ سرگرمیوں کے باعث نکال دیا تھا۔ دو سال ہوئے اخوان المسلمین نے یونیورسٹی میں لجنۃ الروع (مزاحمتی کونسل) قائم کی۔ اس کونسل کی سرپرستی میں طلبہ نے حماس کے کالے نقاب پہن کر اور جنگی اسلحہ ہاتھ میں پکڑ کر مظاہرہ کیا۔ مین گیٹ کو توڑ دیا۔ بعض اساتذہ اور طالب علموں کو مارا پیٹا، جن کو علاج کے لیے ہسپتال بھیج دیا گیا۔ پولیس نے ۱۴۰ کے قریب طلبہ اور اخوان المسلمین کے نائب مرشد انجینئر خیرت شاطر سمیت کئی لیڈروں کو گرفتار کیا۔ گرفتار طلبہ کے ہوسٹل پر چھاپہ مار کر اسلحہ، ملکی اور غیر ملکی کرنسی اور اخوان المسلمین کا لٹریچر قبضے میں لے لیا۔ ''الاہرام''، بابت جمعہ ۱۵ دسمبر ۲۰۰۶ میں ''اسامہ سرایا'' نے ایک مقالہ لکھا ہے کہ کس طرح دو برس سے اخوان المسلمین نے اس درس گاہ کو اپنی سیاسی سرگرمیوں میں ملوث کر رکھا ہے اور جامعۃ الازہر جو اعتدال کی علامت تھی، اس کو تطرف اور شدت پسندی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ وہاں طالب علم ہاتھوں میں ہتھیار پکڑ کر جہاد کے ترانے گا کر جلوس نکالتے ہیں۔ اس مقالہ کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اب لگتا ہے کہ اپنے عقیدے کی اشاعت کے لیے فتووں کے ہتھیار سے ان کی تسلی نہیں ہوئی، چنانچہ اب انھوں نے جنگی ہتھیار تھام لیے ہیں، ان کے ہاتھ بے گناہ انسانوں کے خون سے تو لتھڑے ہوئے ہیں، مگر دشمن کے مقابلہ میں ان کو دفاع کی کبھی توفیق نہیں ہوئی۔''

جامع الحسین

جامع الازہر کے تقریباً سامنے سڑک کے دوسرے کنارے حی الجمالیہ میں جامع الحسین واقع ہے۔ اس کا گول خوب صورت مینار دور سے نظر آتا ہے۔ لوہے کی دو بالکونیاں اسے زینت بخشتی ہیں۔ ان کی چھت مخروطی ہے جس کے اوپر سنہری ہلال بنا ہوا ہے۔ مسجد میں داخل ہونے سے پہلے ایک بہت بڑے اور اونچے پلیٹ فارم سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیرونی دیوار پر سنگ مرمر کی تختی ثبت ہے، جس میں بخاری کی ''الادب المفرد'' اور ''ترمذی'' کے حوالہ سے یہ حدیث کندہ ہے: 'الحسین منی و انا من الحسین' (حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں)۔ مسجد کے اندر بھی دیواروں پر امام حسین کے مناقب میں احادیث اور آثار لکھے ہوئے ہیں۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں۔

ستون سنگ مرمر کے ہیں جو پانچ قطاروں میں بنی ڈاٹ دار محرابوں کو سہارا دے رہے ہیں۔ اوپر کنکریٹ کی چھت ہے۔ ڈاٹ دار محرابیں لکڑی کی پلیوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے مرتبط ہیں اور ان پلیوں پر شمع دان اور فانوس لٹک رہے ہیں۔ وضو کے لیے سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا فوارہ ہے جس کے اوپر جست سے بنا ہوا گنبد ہے جو انجینئرنگ کے نقطۂ نظر سے جدید طرز تعمیر کی اعلیٰ مثال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد کی بنیاد المعزلدین اللہ کے قدیم محل پر رکھی گئی۔ نیچے موجود کمرا اس خلیفہ کے خاص کمروں میں سے ایک کمرا تھا۔ اس کمرے میں امام حسین کا سر دفن ہے۔ ۹ محرم کو یہاں تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ اس قبر کے گرد زائرین کا ہجوم تھا، ایک طرف خواتین جالی پر سر رکھے آہ و بکا کر رہی تھیں۔

تاریخی طور پر یہ ثابت نہیں کہ یہاں امام عالی مقام کا سر دفن ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ''البدایہ والنہایہ'' مطبوعہ مکتب المعارف میں ایک عنوان باندھا ہے: '(أمّا) رأس الحسین رضی اللہ عنه'' ''جہاں تک حسین کے سر کا تعلق ہے:'' اس کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

''مورخین اور سیرت نگاروں کے یہاں مشہور ہے کہ ابن زیاد نے یہ سر یزید بن معاویہ کے پاس بھیج دیا۔ کچھ لوگ اس کا انکار کرتے ہیں، مگر میری رائے میں یہی بات زیادہ مشہور ہے۔ پھر اس بارے میں ان میں اختلاف ہے کہ سر کہاں دفن ہوا؟ محمد بن سعد (صاحب طبقات) نے روایت کی ہے کہ یزید نے یہ سر نائب مدینہ عمرو بن سعد کے پاس بھیجا جس نے اسے ان کی والدہ کے پاس جنت البقیع میں دفن کر دیا۔ اور ابن ابی الدنیا نے عثمان بن عبدالرحمٰن اور اس نے محمد بن عمر بن صالح (دونوں راوی ضعیف ہیں) سے روایت کی ہے کہ سر یزید کی سیف (صندوق) میں پڑا رہا۔ جب وہ فوت ہوا تو سر کو سیف سے نکال کر اسے کفن پہنا کر دمشق کے باب الفرادیس میں دفن کر دیا گیا۔ میں کہتا ہوں کہ باب الفرادیس ثانی کے اندر ہے اس جگہ کا نام آج کل مسجد الرأس (سر والی مسجد) ہے۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں یزید بن معاویہ کی دایہ ''ریّا'' کی زندگی کے حالات میں ذکر کیا ہے کہ یزید کے سامنے امام حسین کا سر رکھا گیا۔ اس نے تین روز تک اس کو دمشق میں لٹکایا پھر اسے اسلحہ خانہ میں رکھ دیا۔ یہاں تک کہ خلیفہ سلیمان بن عبدالملک کے زمانہ میں اسے اس کے پاس لایا گیا۔ وہ سفید ہڈی بن گیا تھا۔ اس نے اسے کفن پہنایا، خوشبو لگائی، نماز جنازہ پڑھی اور اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ جب بنو عباس آئے تو وہ اسے قبر سے نکال کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اور ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ یہ دایہ بنو امیہ کی خلافت کے بعد بھی زندہ رہی۔ اس کی عمر سو سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ واللہ اعلم۔

فاطمی ۴۰۰ھ سے قبل سے لے کر ۶۶۰ھ کے بعد تک مصر پر حکمران رہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ امام حسین کا سر دیار مصر میں بھیجا گیا۔ انھوں نے اسے وہاں ۵۰۰ھ کے بعد دفن کر کے اس پر مزار بنا دیا۔ جسے تاج الحسین کے نام سے یاد

کیا جاتا ہے۔کئی ایک اہل علم ائمہ کا قول ہے کہ (ان کی) یہ بات بے اصل ہے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنے نسب کی ترویج کریں۔ وہ اس بارے میں جھوٹے اور خائن ہیں۔ فاطمیوں کے زمانہ میں ۴۰۰ھ کے قریب قاضی باقلانی اور کئی ایک دوسرے علما نے ان کے دعویٰ کو باطل قرار دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ لوگ اکثر اس قسم کی باتیں رائج کر دیتے ہیں۔ وہ کوئی سر لے آئے ہوں گے، انھوں نے اسے مذکورہ مسجد میں کسی جگہ رکھ دیا ہوگا۔ اور کہہ دیا کہ یہ حسین رضی اللہ عنہ کا سر ہے تو یہ بات چل نکلی۔ واللہ اعلم۔'' (۲۰/۸)

خان الخلیلی

خان الخلیلی سے میری دل چسپی نجیب محفوظ کے ناول ''خان الخلیلی'' سے پیدا ہوئی جس میں مصنف نے خان الخلیلی میں دوڑتی ہوئی زندگی کا نقشہ کھینچ کر اسے امر کر دیا ہے۔اس محلّہ اور بازار کا نام اس کے بانی خلیل کے نام پر ہے۔ یہ جامع الحسین کے بائیں طرف واقع ہے۔اس میں ایک قہوہ خانہ ہے، جس کا نام مقہی الفشاوی ہے جس کو بجا طور پر فخر حاصل ہے کہ یہاں عربی ادب کا واحد نوبل انعام یافتہ ادیب عام لوگوں میں بیٹھ کر گپ شپ لگایا کرتا تھا۔ اس ادیب کا نام نجیب محفوظ ہے۔

جامع الحسین کے دائیں بائیں کئی قہوہ خانے ہیں۔ مسجد سے نکل کر میں نے مقامی سپاہی سے مقہی الفشاوی کا پتا پوچھا تو وہ ہمیں اس قہوہ خانہ میں چھوڑ آیا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے قہوہ پیا۔قہوہ خانہ کے مالک کے ساتھ نجیب محفوظ کی تصویر دیکھی۔قہوہ خانوں کی اہمیت پر فریم میں لگی ہوئی اس کی تحریر پڑھی۔ جو عربی رسالے ''النقاش'' ۱۹۹۸ء سے ماخوذ تھی۔ اس میں وہ لکھتے ہیں: ''قہوہ خانوں نے میری زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ میرے لیے انسانی افکار و شخصیات کا خزانہ ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں قہوہ خانوں کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ حی الظاہر میں شارع قشتمر (مملوکی وزیر کا نام) پر واقع مقہی قشتمر میں بیٹھا کرتے تھے۔ جو مشہور قہوہ خانہ ''عرابی'' سے ٹرام کے ایک اسٹیشن کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس کے تین مشہور ناولوں (ثلاثیات) میں سے ''قصر الشوق'' نامی ناول میں احمد عبدہ کے قہوہ خانہ اور دوسری کتاب ''زقاق المدق'' میں قہوہ خانہ ''کرشۃ'' کا ذکر ہے۔ خان الخلیلی میں قہوہ خانہ رکس جس کا نام بعد میں مقہی الادریس پڑ گیا کا تذکرہ ہے اور ''کرنک'' نامی ناول میں قہوہ خانہ کرنک کا ذکر ہے۔ نجیب محفوظ اگست ۲۰۰۶ میں ۹۴ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی پہلی تصنیف نے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ اس وقت سے لے کر وفات تک ان کے ۳۲ ناول اور ۱۳ افسانوں کے مجموعے شائع ہوئے، وہ

انسانی نفسیات کوخوب سمجھتے تھے اور اپنے افسانوں اور ناولوں کے ہیروز کا نقشہ اس خوب صورتی سے کھینچتے تھے کہ افسانے پر حقیقت کا گمان گزرتا تھا۔ ایک طرف تو انھوں نے عام آدمی کی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے جو چاروں طرف مسائل سے گھرا ہوا ہے تو دوسری طرف عورت کی بے بسی اور مرد کے شاونزم کا نقشہ پیش کیا ہے۔ عورت جسے مال ومتاع (Chattle) تصور کیا جاتا تھا اور جس کا کام شاونیت زدہ مرد کی جنسی تسکین سمجھا جاتا تھا۔ غالباً اسی لیے ایک مذہبی جنونی نے اس نابغہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ شکر ہے کہ اللہ نے انھیں بچالیا۔

مقہی الفشاوی کے پچھواڑے ایک تنگ بازار ہے۔ یہ لاہور میں واقع دلی دروازے کے ڈبی بازار سے ملتا جلتا ہے۔ اسی طرز کی چھوٹی چھوٹی کھوکھا نما دکانیں جن میں سامان کا انبار لگا ہوا تھا۔ اس میں مصری دست کاری، کشمیری شالوں اور ترکی کے کمبل اور چنیوٹ کی طرز کا کلاسیکل بیل بوٹوں والا فرنیچر سب کچھ موجود تھا۔ غیر ملکیوں کو قیمت بہت بتائی جاتی ہے۔ میں نے چند ایک بردیات خریدیں، کچھ پر قرآنی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ اور کچھ پر فراعنہ مصر کی تصویریں بنی تھیں۔

[باقی]

سیرت صحابہ

محمد وسیم اختر مفتی

عمر فاروق رضی اللہ عنہ

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

—— ۹ ——

سیرت وعہد

حضرت نعمان مانعین زکوٰۃ کے خلاف مہم میں حضرت ابوبکر کے میمنہ میں شامل تھے اور عراق کی تمام جنگوں میں حضرت خالد بن ولید کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ وہ قادسیہ اور خوزستان میں بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے انھیں کسکر کا عامل مقرر کیا تو انھوں نے حضرت عمر کو شکایت بھیجی کہ مجھے خراج کی وصولی کا کلکٹر بنا دیا گیا ہے، حالانکہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت عمر نے ان کے پروانۂ تقرری میں لکھا کہ کفار عجم مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہاوند میں جمع ہو گئے ہیں۔ یہ خط ملتے ہی ماہ روانہ ہو جاؤ۔ اہل کوفہ تمھارا ساتھ دیں گے۔ ماہ میں اپنی فوجیں منظم کرنے کے بعد فیرزان کا مقابلہ کرنے نکل پڑنا۔ انھوں نے والئ کوفہ حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کو علیحدہ خط لکھا، حضرت نعمان کا ساتھ دینے کے لیے کوفہ سے بڑی تعداد میں لوگ جمع کرلو جو حضرت حذیفہ بن یمان کی کمان میں ماہ جائیں۔ جنگ نہاوند میں حضرت نعمان کو کوئی حادثہ پیش آئے تو حضرت حذیفہ ان کی جگہ لیں اور حضرت حذیفہ کے نہ ہونے کی صورت میں حضرت نُعیم بن مقرن کمان سنبھالیں۔ ایک روایت کے مطابق انھوں نے حضرت جریر بن عبداللہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سمیت سات آدمیوں کے نام لیے۔ یہ خط سائب بن اقرع کے

ہاتھ بھیجا گیا، حضرت عمر نے پیش آمدہ معرکے میں سائب کو مال فے کی وصولی کا انچارج بھی مقرر کیا۔ ایک مکتوب حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بھی ارسال کیا کہ بصرہ سے کمک لے کر ماہ پہنچو۔ امیر المومنین حضرت عمر فاروق نے سلمیٰ بن قین، حضرت حرملہ بن مریطہ اور ایران میں موجود دوسرے کمانڈروں کو ہدایت کی کہ اپنی اپنی جگہ ایرانیوں کو الجھائے رکھو تاکہ ان کی طرف سے نہاوند مدد نہ پہنچ سکے۔

تینوں اطراف سے فوجیں آ گئیں تو جیش نعمان رضی اللہ عنہ مکمل ہوا، اگلا مرحلہ حلوان تھا۔ یہاں آ کر حضرت نعمان نے نہاوند پہنچنے والے راستوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ انھوں نے حضرت طلیحہ بن خویلد، حضرت عمرو بن معدیکرب اور حضرت عمرو بن ابوسلمیٰ کو بھیجا۔ تینوں کی اطلاع تھی کہ رستہ صاف ہے اور اس میں کوئی فوجی سرگرمی نہیں۔ اب جیش نے کوچ کیا اور اپنی منزل نہاوند پہنچا، حضرت نعمان نے قلعے کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ ڈیڑھ لاکھ کا لشکر رکھتے ہوئے بھی فیرزان نے مسلمانوں کی ۳۰ ہزار نفوس پر مشتمل فوج سے بات چیت ضروری سمجھی۔ وہ قادسیہ کا مفرور تھا اور اسلامی فوج کی شجاعت آزما چکا تھا۔ اس کے کہنے پر حضرت مغیرہ بن شعبہ کو بھیجا گیا۔ فیرزان تاج پہنے طلائی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ چمک دار بھالے اور نیزے لیے کئی گارڈ اسے گھیرے ہوئے تھے۔ اس نے حضرت مغیرہ کو دھمکی دی کہ اگر تم نے فوج کشی ترک نہ کی تو ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ وہ اطمینان سے بولے: رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ہمیں فتح ونصرت ہی حاصل ہوتی رہی ہے، ہم تمھیں مغلوب کر کے رہیں گے یا اسی سرزمین میں جان دے دیں گے۔ حضرت مغیرہ واپس حضرت نعمان کے پاس آئے اور انھیں رپورٹ دی۔ اب جنگ کا مرحلہ شروع ہوا، پہلے دو دن کوئی فوج غلبہ حاصل نہ کر سکی۔ نہاوند کے قلعہ کے باہر آہنی خار نصب تھے، بیچ بیچ میں کچھ راستے چھوڑے گئے تھے۔ ایرانی ان راستوں سے نکلتے اور مسلمان فوجیوں کو لوٹ مار کر واپس چلے جاتے۔ جب مسلمان ان پر جوابی حملہ نہ کر پاتے تو مضطرب ہو جاتے۔ حضرت نعمان بن مقرن نے اپنے لشکر کے آزمودہ کار جرنیلوں سے مشورہ کیا۔ حضرت عمرو بن معدیکرب نے پے در پے حملے کرنے کا مشورہ دیا، ان کے خیال میں ایرانی اسی طرح قلعے سے باہر آ سکتے تھے۔ حضرت طلیحہ بن خویلد نے کہا: ہم حیلہ کر کے ایرانیوں کو میدان جنگ میں لا سکتے ہیں۔ اسی رائے پر عمل کرنے کا فیصلہ ہوا اور ذمہ داری حضرت قعقاع کو دی گئی۔ وہ علی الصبح کچھ فوج لے کر نکلے اور شہر پر تیراندازی شروع کر دی پھر فصیل پھلانگنے کی کوشش بھی کی۔ پہرے دار انھیں روکنے کی کوشش کرتے تو ان کے ساتھی بڑھ بڑھ کر حملہ کرتے۔ پہرے پر مامور ایرانیوں نے جب چند مٹھی بھر مسلمانوں ہی کو اس مہم میں مصروف پایا تو ان کا پیچھا کرتے ہوئے فصیل اور اس کے گرد بچھے خاردار حصار سے باہر نکل آئے۔

حضرت قعقاع نے کچھ دیر جم کر مقابلہ کیا پھر اپنا دستہ لے کر بھاگ نکلے۔ جب وہ اتنی دور نکل آئے کہ ان کا تعاقب کرنے والے ایرانی فوجیوں کا پیچھے کی طرف دھیان نہ رہا تو کثیر تعداد میں مسلمان فوجیوں نے فصیل کے پاس پوزیشنیں سنبھال لیں۔ فیرزان نے سپاہ اسلامی کی پسپائی کی خبر سنی تو اس پر کاری ضرب لگانے کے لیے اپنی تمام فوج شہر سے باہر نکال لایا۔ شہر کے دروازے پر چند پہرے دار ہی رہ گئے تھے۔ حضرت قعقاع نے کافی دور جا کر اپنے دستے کو روکا اور واپس اسلامی فوج سے آملے۔ حضرت نعمان نے ہدایت جاری کی کہ سورج ڈھلنے سے پہلے ایرانیوں سے جنگ نہ چھیڑی جائے، لیکن ایرانی فوج زوال سے قبل ہی آ کر مقابلے پر کھڑی ہو گئی۔ ان کی جانب سے تیر چلا کر کچھ مسلمانوں کو زخمی کیا گیا تو بھی انھوں نے لڑائی شروع کرنے کی اجازت نہ دی۔ زوال کے وقت نعمان رضی اللہ عنہ اپنے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کے تمام رسالوں میں گئے اور جوانوں کی ہمت بندھائی۔ انھوں نے ہدایت دی کہ میری پہلی تکبیر پر چست ہو جانا، دوسری پر اسلحہ بند اور جب میں تیسری دفعہ اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤں تو دشمن پر ٹوٹ پڑنا۔ جوں ہی ان کا نعرہ بلند ہوا، سپاہیوں نے دھاوا بول دیا، وہ عقاب کی سی تیزی سے ایرانیوں پر وار کرتے رہے۔ ایرانیوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے، لیکن انھوں نے بھی سخت جوابی حملے کیے، فوجیوں کی للکاروں کے ساتھ تلواروں کے تلواروں سے ٹکرانے کا شور برپا ہو گیا۔ سورج ڈوبنے کو آ گیا، اس قدر ایرانی مارے گئے کہ میدان جنگ ان کے خون سے لتھڑ گیا۔ حضرت نعمان اسلامی پرچم تھامے ہوئے دشمن کے قلب میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کا گھوڑا پھسلا، وہ گرے تھے کہ ایک تیر ان کے پہلو میں آن لگا۔ ان کے بھائی حضرت نُعیم نے ان کے جسم کو کپڑے سے ڈھانک دیا اور پرچم حضرت عمر کی ہدایت کے مطابق حذیفہ رضی اللہ عنہ کو تھما دیا۔ اندھیرا چھا چکا تھا اور جنگ کا بازار گرم تھا۔ حضرت حذیفہ فوج کی کمان کرتے رہے اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ رات گئے ایرانی پسپا ہوئے، ان کے اپنے بچھائے ہوئے خاروں نے ان کی واپسی کی راہ مسدود کر دی۔ اس طرح ان کے فوجی کثرت سے مارے گئے، کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں، لیکن زیادہ تر قلعے کے گرد کھدی گہری خندق میں گرنے سے ہلاک ہوئے۔ اہل تاریخ کا کہنا ہے کہ مقتولوں کی تعداد ا لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔

اس مرحلے پر فیرزان نے اپنی فوج کو چھوڑا اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے اکیلے ہی ہمدان کی راہ پکڑی۔ حضرت نُعیم نے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا اور قعقاع کو اس کا پیچھا کرنے کو کہا۔ فیرزان بھاگتا ہوا درۂ ہمدان جا پہنچا، آگے سے شہد سے لدے ہوئے خچروں اور گدھوں کا قافلہ آ رہا تھا۔ وہ گھوڑے سے اتر آیا اور پہاڑوں میں چھپنے کی کوشش کی، لیکن حضرت قعقاع نے اسے جا لیا اور جہنم رسید کیا۔ اس واقعے کی وجہ سے اس درے کو درۂ شہد کہا جانے لگا۔ کچھ اور

بھگوڑوں نے بھی ہمدان میں پناہ لی۔ مسلمانوں نے ہمدان کا محاصرہ کر لیا تو شہر کے باشندگان اور پناہ گیر صلح پر مجبور ہو گئے۔ نہاوند فتح ہونے کے بعد حذیفہ نے ہر سوار کو ۶ ہزار اور پیادہ کو ۲ ہزار درہم حصہ دیا۔ انھوں نے باہر رہ کر فوج کی مدد کرنے والوں کو بھی عطیات دیے اور باقی غنائم حضرت عمر کے مقرر کردہ مُحصّل سائب کے حوالے کیے۔

اس موقع پر پارسی آتش کدے کا والی ہرند حذیفہ کے پاس آیا۔ اس نے قیمتی جواہرات کے دو صندوق اس شرط پر دینے کی پیش کش کی کہ اسے امان دے دی جائے۔ یہ شاہ ایران نے اپنے برے وقت کے لیے اس کے پاس رکھوائے ہوئے تھے۔ اہل جیش صندوق پا کر بہت خوش ہوئے، لیکن سب نے فیصلہ کیا کہ مال غنیمت میں ملنے والا حصہ ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ یہ صندوق امیر المومنین حضرت عمر فاروق کے ذاتی حصے کے طور پر رکھ لیے جائیں۔

مدینہ میں عمر رضی اللہ عنہ کو نہاوند ہی کی فکر تھی، راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہ فتح کی دعائیں مانگتے۔ حذیفہ خوش خبری سنانے کے لیے طریف بن سہم کو بھیج چکے تھے، مال فے اور خسروی صندوق لے کر سائب بعد میں روانہ ہوئے۔ نصرت کی خبر سن کر امیر المومنین سجدے میں گر پڑے۔ پھر انھوں نے حضرت نعمان کے بارے میں استفسار کیا۔ ان کی شہادت کا پتا چلا تو اتنا روئے کہ ہچکی بندھ گئی۔ باقی شہدا کے بارے میں بھی فرداً فرداً استفسار کیا، رات کا وقت تھا، خمس مسجد نبوی میں رکھوا کر حضرت عمر نے حضرت عبدالرحمان بن عوف اور حضرت عبداللہ بن ارقم کو نگرانی کے لیے مقرر کیا۔ جب وہ گھر پہنچے تو جواہرات کے صندوق ان کے سپرد کیے گئے اور بتایا گیا کہ یہ غازیوں کی خواہش کے مطابق خاص آپ کے لیے رکھے گئے ہیں۔ سائب کوفہ پہنچے ہی تھے کہ حضرت عمر کے قاصد نے آن لیا، وہ فوراً ہی مدینہ پلٹ آئے۔ خلیفۂ ثانی نے کہا: تیرا بھلا ہو! رات بھر خواب میں فرشتے مجھے ان صندوقوں کی طرف گھسیٹ گھسیٹ کر لے جاتے رہے۔ یہ آگ سے بھڑک رہے تھے اور وہ مجھے ان سے داغنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں انھیں مسلمانوں میں بانٹ دوں گا۔ انھیں دور لے جاؤ اور بیچ کر رقم مسلمانوں کے عطیات میں شامل کر دو۔ سائب بن اقرع نے ان صندوقوں کے جواہرات کوفہ کی مسجد میں فروخت کے لیے رکھے، عمرو بن حریث مخزومی نے ۲۰ لاکھ درہم میں خرید لیے اور ۴۰ لاکھ درہم میں واپس ایرانیوں کو فروخت کر دیے۔ طبری کی روایت کے مطابق سیدنا عمر نے انھیں فاتح نہاوند حذیفہ کے پاس واپس بھجوا دیا اور انھوں نے ۴۰ لاکھ میں بیچ کر ہر گھڑ سوار کو ۴ ہزار درہم اضافی حصہ دے دیا۔

تمام اہل اسلام فتح نہاوند سے بے حد خوش تھے بالخصوص اہل کوفہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ انھوں نے اسے ''فتح الفتوح'' کا نام دیا۔ حقیقت یہی ہے کہ ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے، سقوط نہاوند کے بعد انھیں ان کے اپنے وطن ہی میں

جاے قرار نہ مل سکی۔ امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ بھی بے حد خوش تھے، انھوں نے اس جنگ میں بہادری کے جوہر دکھانے والوں کو مزید دو دو ہزار درہم عطا کیے۔ طبری کے خیال میں یہ معرکہ ۲۱ھ میں جبکہ دوسری روایت کے مطابق ۱۹ھ میں پیش آیا۔ ابوموسیٰ اشعری نہاوند سے واپس ہوئے تو دینور میں پڑاؤ ڈالا، پانچویں دن مختصر جنگ ہوئی اور وہاں کے رہنے والوں نے صلح کر لی۔ پھر انھوں نے سیروان کو زیر کیا۔ صیمرہ کے باشندے حضرت ابوموسیٰ کے مقرر کردہ عامل کو جزیہ و خراج دینے پر آمادہ ہوئے اور حضرت حذیفہ بن یمان نے ماہ کے حاکم دنبار سے صلح کا معاہدہ کیا۔

جنگ نہاوند کے بعد امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے ایران میں موجود اسلامی افواج کی تنظیم نو کی۔ انھوں نے احنف بن قیس کو خراسان کا کمانڈر مقرر کیا، مجاشع بن مسعود کی تقرری اردشیر اور سابور کے لیے اور عثمان بن ابوالعاص کی اصطخر کے لیے کی، ساریہ بن زُنیم کو درابجرد بھیجا۔ خلیفۂ دوم نے حضرت سہیل بن عدی کو کرمان کا علم دیا، عاصم بن عمرو کو سجستان اور حکم بن عمرو کو مکران کے پرچم عطا کیے۔ اسی اثنا میں یزدگرد رے سے اصفہان جا پہنچا اور وہاں کے لوگوں کو جنگ پر اکسانے لگا۔ حضرت عمر نے حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان اور حضرت نعمان بن مقرن کے لشکر اصفہان روانہ کر دیے۔ ان کی خواہش تھی کہ یزدگرد قید ہو جائے تاکہ ایران کے محاذ پر جنگ کا خاتمہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ ابن عتبان کی فوج کو اصفہان کے باہر ایک بڑے ایرانی لشکر کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے سپہ سالار استندار نے کوئی مہلت دیے بغیر جنگ چھیڑ دی۔ اس کی توقع کے برعکس بھاری تعداد میں ایرانی مرنے لگے تو ایک بوڑھا ایرانی سورما شہریار بن جاذویہ جو مقدمے کی کمان سنبھالے ہوئے تھا، آگے بڑھا اور مبارزت کے لیے للکارا۔ عبداللہ بن ورقا نکلے اور اسے جہنم رسید کیا۔ اس کی ہلاکت کے بعد ایرانی مضطرب ہو کر پلٹے اور اصفہان کے شاہی محلات جیّ کی فصیل میں پناہ لی، یزدگرد کرمان کو بھاگ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان نے جیّ کا محاصرہ کر لیا۔ پہلے ایرانی قلعے سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملے کرتے رہے، پھر تنگ آ کر ایک فیصلہ کن معرکے کے لیے صف آرا ہوئے۔ جنگ سے پہلے اصفہانیوں کا سالار فاذوستان عبداللہ کے پاس آیا اور کہا: اپنے ساتھیوں کا خون کرنے سے بہتر ہے ہم دوبدو مقابلہ کر لیں۔ جو بچ گیا، غالب آ جائے گا۔ کچھ دیر دونوں میں زور آزمائی ہوئی تھی کہ فاذوستان بولا: تجھ جیسے دلیر سے لڑنے کے بجائے میں محض ایک شرط پر اصفہان تمھارے حوالے کرنے کو تیار ہوں، ہم میں سے جو اصفہان چھوڑ کر جانا چاہتا ہے، اسے نہ روکو۔ اس طرح اصفہانی اہل ذمہ میں شامل ہو گئے، صرف ۳۰ آدمی ایسے تھے جنھوں نے کرمان جانا پسند کیا۔

دوسری طرف بحر قزوین (کشرین) کے جنوب میں واقع شہروں کے حکمران قادسیہ میں جہنم واصل ہونے والے جرنیل رستم کے بھائی اسفندیار کی قیادت میں اکٹھے ہو گئے اور مسلمانوں کی رے کی جانب پیش قدمی روکنے کی پیش بندی کرنے لگے۔ اہل ہمدان کو ان کے گٹھ جوڑ کا پتا چلا تو وہ بھی خلافت اسلامی سے کیا ہوا معاہدۂ صلح توڑ کر ان کے ساتھ مل گئے۔ حضرت عمر نے حضرت نُعیم بن مقرن کو حکم دیا کہ جلد از جلد ہمدان پہنچو اور وہاں کے باشندوں کو ایسا سبق سکھاؤ کہ پھر کوئی عہد شکنی کی جرأت نہ کرے۔ اہل ہمدان جب ان کے محاصرے میں آ گئے تو صلح کی درخواستیں کرنے لگے۔ حضرت نُعیم نے صلح قبول کر لی، انھوں نے عروہ بن زید کو فتح کی بشارت دے کر مدینہ بھیجا۔ حضرت عمر نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ واج رود کے مقام پر تین اطراف سے حرکت کر کے ایرانی قوتوں نے ڈیرا ڈال دیا ہے، دیلم سے مُوتا، رے سے زبندی (زینبی) اور آذربائیجان سے اسفندیار اپنا اپنا لشکر لے کر پہنچ چکے ہیں تو فوراً حضرت نُعیم کو خط لکھا کہ ہمدان پر اپنا نائب مقرر کر کے رے کی جانب کوچ کرو اور اہل فارس کی جمعیت کا مقابلہ کرو۔ چنانچہ حضرت نُعیم نے یزید بن قیس کو والیِ ہمدان مقرر کیا اور ۱۲ ہزار کا جیش لے کر واج رود پہنچے۔ وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے معلومات حاصل کر کے چلے تھے، لیکن ایرانیوں نے میدان جنگ میں ان کی فوج اترتے ہی دھاوا بول دیا۔ جنگ نہاوند کی مانند سخت لڑائی ہوئی، تاہم شام ہونے تک ایرانی شکست کھا چکے تھے، شاہ دیلم مُوتا اس جنگ میں مارا گیا۔ جنگ میں شریک رے کی فوج نے بھی شکست کھائی، لیکن شہر رے کا فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا۔ بہرام کا پوتا سیاوخش وہاں کا حکمران تھا۔ اسے یقین تھا کہ واج رود کے بعد مسلمان میری حکومت کے درپے ہوں گے۔ اس نے دنباوند، طبرستان، قُومس اور جرجان سے فوجی مدد طلب کر رکھی تھی۔ جیش نُعیم سے کئی گنا زیادہ فوجی قوت اکٹھی ہو گئی تو وہ رے میں قلعہ بند ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ اسلام کے سپاہی اس پر غالب نہ آ سکیں گے۔ رے کے بڑے آتش کدے اور اس کے گرد قائم معبدوں کی وجہ سے تمام مجوسی اس شہر کی حفاظت کو مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ سیاوخش نے واج رود میں ہزیمت اٹھانے کے بعد زبندی (زینبی) کو سخت برا بھلا کہا تھا اور اسے اس کے منصب سے معزول کر دیا تھا۔ وہ آزردہ ہو کر حضرت نُعیم سے آملا۔ جبل رے کے دامن میں جنگ شروع ہوئی، پہلا دن سخت گزرا اور کوئی فوج برتری حاصل نہ کر سکی۔ زبندی (زینبی) نے حضرت نُعیم کو مشورہ دیا کہ آپ ایرانیوں کو جنگ میں الجھائے رکھیں اور میں خفیہ راستے سے شہر کے اندر داخل ہوتا ہوں۔ انھوں نے اپنے بھتیجے منذر بن عمرو کی قیادت میں کچھ گھڑ سوار زبندی (زینبی) کے ساتھ بھیجے اور خود رات بھر رے کا دفاع کرنے والی فوج پر تیر اندازی کرتے رہے۔ فوج اندرون شہر کا دھیان نہ رکھ سکی۔ فجر کے وقت شہر کے اندر تکبیر کے نعرے بلند ہوئے تو رے والوں کو یقین ہو گیا کہ ہم

گھر گئے ہیں۔ ان پر آخری اور فیصلہ کن حملہ ہوا، کئی کھیت رہے اور کئی گھائل ہوئے، باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ مسلمانوں کو رے سے معرکۂ مدائن جتنا مال فے حاصل ہوا۔ حضرت نُعیم نے فوجی تنصیبات اور قلعوں کو مسمار کرا کر قدیم شہر کے پڑوس میں ایک نیا شہر بسانے کا حکم دیا۔ انھوں نے زبندی (زینبی) کو حاکم رے مقرر کیا۔ فتح کی خوش خبری کے ساتھ خمس امیر المومنین کی خدمت میں ارسال کر دیا گیا۔ یوں آل بہرام کا خاتمہ ہوا، رے کی عظمت و شوکت اسلامی ادوار میں بھی برقرار رہی تا آنکہ منگولوں نے اسے تاراج کیا، تب اس کے شمال مغرب میں واقع تہران کو دار الخلافہ بنا لیا گیا۔ اس کے کھنڈرات اس کے شان دار ماضی کا پتا دیتے ہیں۔ واقدی کا کہنا ہے کہ ہمدان و رے کے معرکے ۲۲ھ میں پیش آئے جبکہ سیف کے خیال میں ان کا سن وقوع ۱۹ھ ہے۔

سقوط رے کے بعد آس پاس کے علاقوں کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ اہل دنباوند رے والوں کا ساتھ دے کر ہزیمت اٹھا چکے تھے اس لیے ۲ لاکھ درہم سالانہ جزیہ کا اقرار کر کے حضرت نُعیم کے ساتھ صلح کر لی۔ حضرت عمر نے ان کے بھائی سوید بن مقرن کو قُومس بھیجا تو کوئی مقابلے کے لیے نہ نکلا۔ سوید یہاں سے بسطام پہنچے اور شاہ جرجان کو خط لکھا کہ صلح کر لو یا اسلامی افواج کا سامنا کرو۔ اس نے صلح میں خیر سمجھی۔ طبرستان کے بادشاہ نے دیکھا کہ مسلمان جنوب اور مشرق دونوں طرف سے اس کے سر پر آن پہنچے ہیں تو اس نے بھی جزیہ دینا قبول کیا۔ اسی اثنا میں خلیفۂ ثانی نے حضرت عتبہ بن فرقد اور حضرت بکیر بن عبداللہ کو آذر بائیجان کی مہم کے لیے مامور کیا۔ پہلے بکیر فوج لے کر چلے، ان کا مقابلہ اسفند یار سے ہوا جو واج رود میں ہزیمت اٹھانے کے بعد اپنے لشکر کے ساتھ واپس جا رہا تھا۔ اس نے ایک زوردار جنگ کے بعد شکست کھائی اور قید ہوا۔ سماک بن خرشہ (ابو دجانہ) کی قیادت میں حضرت نُعیم کی بھیجی ہوئی کمک بعد میں پہنچی۔ ادھر عتبہ کی سپاہ نے اسفند یار کے بھائی بہرام کی فوج کو مار بھگایا تو آذر بائیجان کا پہاڑی اور میدانی تمام علاقہ مفتوح ہو گیا۔ اب امیر المومنین نے حضرت عتبہ کو آذر بائیجان کا گورنر مقرر کیا، انھوں ہی نے اسفند یار کے ساتھ صلح کا معاہدہ طے کیا۔ عمر نے بکیر کو آذر بائیجان سے آگے بحر قزوین پر واقع باب الابواب (دربند شروان) نامی بندرگاہ کی طرف جانے کا حکم دیا جہاں شاہ ارمینیا شہر براز کی حکومت تھی۔ ان کی ہدایت پر حضرت ابوموسیٰ اشعری نے بھی سراقہ بن عمرو کی کمان میں ایک لشکر اس طرف بھیجا، عبدالرحمان بن ربیعہ سالار مقدمہ تھے۔ شہر براز نے عبدالرحمان سے رابطہ کر کے صلح کی درخواست کی۔ انھوں نے سراقہ کے پاس بھیج دیا، جنھوں نے بغیر جنگ کیے دربند (باب الابواب) کا زیر ہونا منظور کر لیا۔ معاہدہ میں طے پایا، جو اسلامی فوج کے ساتھ مل کر دشمن کا مقابلہ کرے گا، اس سے جزیہ ساقط ہو جائے گا۔ یہ شق منظوری کے لیے حضرت عمر کے پاس پہنچی تو انھوں نے تحسین کے ساتھ

اجازت دے دی۔اب سراقہ نے کچھ دستے ارمینیا کی پہاڑی بستیوں میں بھیجے،اہل موقان کے علاوہ سب جزیہ ادا کرنے پر آمادہ ہوئے۔بکیر نے شہر کا محاصرہ کر لیا تو انھیں بھی صلح کرنا پڑی۔اسی دوران میں سراقہ نے وفات پائی اور کمان عبدالرحمٰن بن ربیعہ کے ہاتھ آئی۔ان کا ارادہ ترکستان پر فوج کشی کا تھا کہ خلیفۂ دوم عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آ گئی،چنانچہ یہ مہم عہد عثمانی میں سر ہوئی۔

مطالعۂ مزید:البدایہ والنہایہ(ابن کثیر)،تاریخ الاسلام(ذہبی)،الفاروق عمر(محمد حسین ہیکل)۔

[باقی]

جاوید احمد غامدی

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ میں نے اِس دین کو جس طرح سمجھا ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ اِسی کتاب کا خلاصہ ہے جس میں کتاب کا نفس مضمون اُس کے علمی مباحث اور اُن کے استدلالات سے الگ کر کے سادہ طریقے پر پیش کر دیا گیا ہے۔

—— جاوید

قانون معاشرت

انسان کے خالق نے اُسے ایک معاشرت پسند حیوان کی فطرت عطا فرمائی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اِس طرح نہیں ہوتی کہ اُس کا خالق اُسے آسمان پر کہیں بنا کر بالکل عالم شباب میں براہ راست زمین پر نازل کرتا اور پھر ہرم وشیب کے مراحل سے گزارے بغیر اِسی عالم شباب میں اُسے واپس لے جاتا ہے۔ اِس کے برخلاف اُس کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تہ بر تہ ظلمتوں میں ایک ناتواں بچے کی حیثیت سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ آغوش مادر میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ہمکتا، کھیلتا، دوسروں کے ہاتھ سے کھاتا، پیتا اور اپنی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ وہ پہلے زمین پر گھسٹتا، گھٹنوں کے بل چلتا اور پھر بڑی مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ اِس کے بعد بھی قدم قدم پر اُسے سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بچپن اور لڑکپن کے کئی مراحل طے کر کے وہ پندرہ یا سولہ برس کے سن کو پہنچ کر کہیں جوان ہوتا ہے۔ اُس کا یہ دور شباب بھی بیس تیس برس سے زیادہ طویل نہیں ہوتا۔ اِس کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ بڑھاپے کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بارہا علم و معرفت کی انتہائی بلندیوں کو چھونے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر ناتواں بچوں ہی کی طرح دوسروں کے رحم و کرم پر زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

انسان کا یہ معاملہ لازماً تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک معاشرت پسند ہستی کی زندگی بسر کرے۔ مرد و عورت کی حیثیت

سے یہ معاشرت خلقت کی ابتدا ہی سے بہ تمام وکمال خود اُس کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ اِس کو تلاش کرنے کے لیے اُسے اپنے وجود سے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ اِس دنیا میں آتا ہے تو اپنا ساز و برگ اور خیمہ و خرگاہ ساتھ لے کر آتا ہے اور وادی و کوہ سار ہو یا دشت و بیاباں، ہر جگہ اپنی بزم خود آراستہ کر لیتا ہے۔

انسان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُس کی تخلیق میں پنہاں اِسی اسکیم کے پیش نظر سیدنا آدم علیہ السلام جب پہلے انسان کی حیثیت سے اِس دنیا میں تشریف لائے تو اُنھیں تنہا نہیں بھیجا گیا، بلکہ اُن کی رفاقت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُنھی کی جنس سے اُن کا جوڑا بنایا۔ پھر اُس سے بہت سے مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیے، یہاں تک کہ خاندان، قبیلہ اور بالآخر ریاست کی سطح پر نظم معاشرت وجود میں آیا جس میں انسان کو وہ سب کچھ میسر ہو گیا جو اُس کی مخفی صلاحیتوں کو روبہ عمل کرنے کے لیے ناگزیر تھا۔

یہی حقائق ہیں جن کے پیش نظر انبیا علیہم السلام کے دین میں زوجین کی مستقل رفاقت کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ انسان کو اُس کے بچپن سے بڑھاپے تک سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ اُس کی حیاتی، نفسیاتی، اور معاشرتی ضرورتوں کے لحاظ سے یہی طریقہ عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اِس سے جو معاشرت وجود میں آتی ہے، اُس کے بعض اہم معاملات میں عقل انسانی کی رہنمائی کے لیے ایک مفصل قانون انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے بنی آدم کو دیا گیا ہے۔ یہ قانون درج ذیل ہے:

نکاح

عورتوں اور مردوں کے ایک دوسرے سے جنسی تسکین حاصل کرنے کا جائز طریقہ صرف نکاح ہے۔ علانیہ ایجاب و قبول کے ساتھ یہ مرد و عورت کے درمیان مستقل رفاقت کا عہد ہے جو لوگوں کے سامنے اور کسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اِس موقع پر تذکیر و نصیحت کے بعد پورے اہتمام اور سنجیدگی کے ساتھ باندھا جاتا ہے۔ اِس کے لیے عورتیں بھی مردوں کی طرح اپنی مرضی کی مالک ہیں اور حدود الٰہی کے اندر اپنے فیصلے کرنے کے لیے پوری طرح آزاد ہیں۔ اُن کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز اُن پر مسلط نہیں کی جا سکتی۔

محرمات

ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی سے نکاح ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ماں کے لیے بیٹے،

بیٹی کے لیے باپ، بہن کے لیے بھائی، پھوپھی کے لیے بھتیجے، خالہ کے لیے بھانجے، بھانجی کے لیے ماموں اور بھتیجی کے لیے چچا کی نگاہ جنس وشہوت کی ہر آلایش سے پاک رہے۔ اِس لیے کہ اِن رشتوں میں اس نوعیت کا علاقہ شرف انسانی کا ہادم اور شرم وحیا کے اُس پاکیزہ احساس کے بالکل منافی ہے جو انسانوں اور جانوروں میں وجہ امتیاز ہے۔ یہی حکم رضاعی رشتوں کا ہے۔ چنانچہ ہر وہ رشتہ جو نسب کے تعلق سے حرام ہے، رضاعت سے بھی حرام ہو جاتا ہے۔ نسب اور رضاعت کے بعد ایک تعلق مصاہرت کا ہے۔ اِس سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں، اُن کا تقدس بھی فطرت انسانی کے لیے بالکل واضح ہے۔ چنانچہ خسر کے لیے بہو اور شوہر کے لیے بیوی کی ماں، بیٹی، بہن، خالہ، پھوپھی، بھانجی اور بھتیجی سے نکاح ممنوع ہے۔ تاہم یہ رشتے چونکہ بیوی اور شوہر کی وساطت سے قائم ہوتے ہیں اور اِس سے ایک نوعیت کا ضعف اِن میں پیدا ہو جاتا ہے، اِس لیے قرآن نے یہ تین شرطیں ان پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ بیٹی صرف اُس بیوی کی حرام ہے جس سے خلوت ہو جائے۔

دوسری یہ کہ بہو کی حرمت کے لیے بیٹے کا صلبی ہونا ضروری ہے۔

تیسری یہ کہ بیوی کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی اور بھتیجی کی حرمت اُس حالت کے ساتھ خاص ہے، جب میاں بیوی میں نکاح کا رشتہ قائم ہو۔

حدود وشرائط

نکاح مال، یعنی مہر کے ساتھ ہونا چاہیے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ ایک فریضہ کی حیثیت سے یہ نکاح کی ایک لازمی شرط ہے۔ مرد وعورت نکاح کے ذریعے سے مستقل رفاقت کا جو عہد باندھتے ہیں، اُس میں نان ونفقہ کی ذمہ داریاں ہمیشہ سے مرد اٹھاتا رہا ہے، یہ اُس کی علامت (token) ہے۔ اِس کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی گئی۔ اِسے معاشرے کے دستور اور لوگوں کے فیصلے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ عورت کی سماجی حیثیت اور مرد کے معاشی حالات کی رعایت سے وہ جتنا مہر چاہیں، مقرر کر سکتے ہیں۔

نکاح کے لیے پاک دامن ہونا بھی ضروری ہے۔ کوئی زانی کسی عفیفہ سے اور کوئی زانیہ کسی مرد عفیف سے نکاح نہیں کر سکتی، الاّ یہ کہ معاملہ عدالت میں نہ پہنچا ہو اور وہ توبہ واستغفار کے ذریعے سے اپنے آپ کو اِس گناہ سے پاک کر لیں۔ یہی معاملہ شرک کا ہے۔ جس طرح یہ بات گوارا نہیں کی جا سکتی کہ میاں اور بیوی میں سے کوئی دوسرے کے بستر پر سوئے، اِسی طرح یہ بات بھی کسی مسلمان کے لیے قابل برداشت نہیں ہو سکتی کہ اُس کے گھر میں خدا کے ساتھ

کسی اور کی پرستش کی جائے، بلکہ یہ اُس کے نزدیک کسی اور کے بستر پر سونے سے زیادہ قابل نفرت چیز ہے۔ یہود و نصاریٰ کے معاملے میں، البتہ اتنی رعایت ہے کہ اُن کی پاک دامن عورتوں سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نکاح کی اجازت دی ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ شرک جیسی نجاست سے پوری طرح آلودہ ہونے کے باوجود وہ اصلاً توحید ہی کے ماننے والے ہیں۔

حقوق و فرائض

خاندان کا ادارہ بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ جس طرح ہر ریاست اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے، اِسی طرح یہ ریاست بھی ایک سربراہ کا تقاضا کرتی ہے۔ سربراہی کا مقام اِس ریاست میں مرد کو بھی دیا جا سکتا تھا اور عورت کو بھی۔ قرآن نے بتایا ہے کہ مرد کی بعض خلقی صلاحیتوں کے پیش نظر یہ اُسے دیا گیا ہے اور اِس کے لازمی نتیجے کے طور پر عورتوں سے تقاضا کیا گیا ہے کہ اولاً، اُنھیں اپنے شوہروں کے ساتھ موافقت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ثانیاً، شوہر کے رازوں اور اُس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

عورت اگر شوہر کی اِس حیثیت کو چیلنج کر کے گھر کے نظام کو تلپٹ کر دینے پر آمادہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے گھر کو بچانے کے لیے مرد تین صورتیں اختیار کر سکتا ہے:

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ قرآن میں اِس کے لیے وعظ کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اِس میں کسی حد تک زجر و توبیخ بھی ہو سکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دیا جائے تاکہ اُسے اندازہ ہو کہ اُس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اِس کے نتائج غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ عورت کو جسمانی سزا دی جائے۔ یہ سزا اتنی ہی ہو سکتی ہے، جتنی کوئی معلم اپنے زیر تربیت شاگردوں کو یا کوئی باپ اپنی اولاد کو دیتا ہے۔

یہ تینوں صورتیں ترتیب و تدریج کے ساتھ ہیں۔ یعنی پہلی کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری صورت اُسی وقت اختیار کرنی چاہیے، جب آدمی مطمئن ہو جائے کہ بات نہیں بنی اور اگلا قدم اٹھانے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ شوہر کے تادیبی اختیارات کی یہ آخری حد ہے۔ اِس سے اصلاح ہو جائے تو عورت کے خلاف انتقام کی راہیں نہیں ڈھونڈنی چاہییں۔

بیوی اگر ناپسند بھی ہو تو اُس سے اپنا دیا دلایا واپس لینے کے لیے اُس کو ضیق میں ڈالنے اور تنگ کرنے کی کوشش کسی بندۂ مومن کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس طرح کا رویہ صرف اُس صورت میں گوارا کیا جا سکتا ہے، جب وہ کھلی ہوئی بدکاری کرنے لگے۔ اِس قسم کی کوئی چیز اگر اُس سے صادر نہیں ہوئی ہے، وہ اپنی وفاداری پر قائم ہے اور پاک دامنی کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہے تو محض اِس بنیاد پر کہ بیوی پسند نہیں ہے، اُس کو تنگ کرنا عدل و انصاف اور فتوت و شرافت کے بالکل منافی ہے۔ اخلاقی فساد، بے شک قابل نفرت چیز ہے، لیکن محض صورت کے ناپسند ہونے یا کسی ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر اُسے شریفانہ معاشرت کے حقوق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ناپسندیدگی کے باوجود اُس کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہیے جو شریفوں کے شایان شان ہو، عقل و فطرت کے مطابق ہو، رحم و مروت پر مبنی ہو اور اُس میں عدل و انصاف کے تقاضے ملحوظ رہے ہوں۔

تعدد ازواج

انسان کی تخلیق جس فطرت پر ہوئی ہے، اُس کی رو سے خاندان کا ادارہ اپنی اصلی خوبیوں کے ساتھ ایک ہی مرد و عورت میں رشتۂ نکاح سے قائم ہوتا ہے۔ یہ تمدن کی ضروریات اور انسان کے نفسی، سیاسی اور سماجی مصالح ہیں جن کی بنا پر تعدد ازواج کا رواج کم یا زیادہ، ہر معاشرے میں رہا ہے اور اِنھی کی رعایت سے اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کسی شریعت میں اِسے ممنوع قرار نہیں دیا۔ تاہم یتیموں کی مصلحت کے پیش نظر جب قرآن نے اِس رواج سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی ہے تو اِس کے ساتھ یہ دو شرطیں بھی اِس پر عائد کر دی ہیں:

ایک یہ کہ یتیموں کے حقوق جیسی مصلحت کے لیے بھی عورتوں کی تعداد کسی شخص کے نکاح میں چار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔

دوسری یہ کہ بیویوں کے درمیان انصاف کی شرط ایک ایسی اٹل شرط ہے کہ آدمی اگر اِسے پورا نہ کر سکتا ہو تو اِس طرح کی کسی اہم دینی مصلحت کے پیش نظر بھی ایک سے زیادہ نکاح کرنا اُس کے لیے جائز نہیں ہے۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ظاہر کے برتاؤ اور دل کے لگاؤ میں کسی پہلو سے کوئی فرق باقی نہ رہے۔ اِس طرح کا انصاف کسی کی طاقت میں نہیں ہے اور کوئی شخص یہ کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا۔ دل کے میلان پر آدمی کو اختیار نہیں ہوتا، لہٰذا اتنا کافی ہے کہ شوہر ایک بیوی کی طرف اِس طرح نہ جھک جائے کہ دوسری بالکل معلق ہو کر رہ جائے۔

نکاح یتیموں کے حقوق کی نگہداشت کے لیے کیا گیا ہو یا کسی اور مقصد سے، مہر اور عدل عورت کا حق ہے اور یہ

نہایت خوش دلی کے ساتھ ادا ہونا چاہیے،لیکن اگر اندیشہ ہو کہ بیویوں میں برابری کے حقوق پر اصرار کے نتیجے میں شوہر بیوی سے بے پروائی برتے گا یا پیچھا چھڑانے کی کوشش کرے گا تو اِس میں حرج نہیں کہ دونوں مل کر آپس میں کوئی سمجھوتا کر لیں۔

مباشرت کے حدود

حیض و نفاس کے دنوں میں میاں بیوی کا جنسی تعلق ممنوع ہے۔ یہ پابندی خون کے بند ہو جانے تک ہے، اِس کے بعد یہ باقی نہیں رہتی،لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لے،تب اُس سے ملاقات کی جائے اور لازماً اُسی راستے سے کی جائے جو اللہ نے اِس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

ایلا

بیوی سے ازدواجی تعلق منقطع کر لینا کسی عذر معقول کے بغیر جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر اِس کے لیے قسم بھی کھالی گئی ہے تو اُسے توڑ دینا ضروری ہے۔ اِس کے لیے چار مہینے کی مدت مقرر ہے۔شوہر پابند ہے کہ اِس کے اندر یا تو بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لے یا طلاق دینے کا فیصلہ ہے تو اُس کو طلاق دے دے۔

ظہار

اگر کوئی شخص منہ پھوڑ کر بیوی کو ماں سے یا اُس کے کسی عضو کو ماں کے کسی عضو سے تشبیہ دیتا ہے تو اِس سے بیوی ماں نہیں ہو جاتی اور نہ اُس کو وہ حرمت حاصل ہو سکتی ہے جو ماں کو حاصل ہے۔ لہٰذا اِس طرح کی تشبیہ سے نہ کسی کا نکاح ٹوٹتا ہے اور نہ اُس کی بیوی اُس کے لیے ماں کی طرح حرام ہو جاتی ہے۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُسے بغیر کسی تنبیہ کے چھوڑ دیا جائے۔ انسان کی معاشرتی زندگی پر اِس طرح کی باتوں کے اثرات بڑے غیر معمولی ہوتے ہیں، اِس وجہ سے ضروری ہے کہ اُس کی تادیب کی جائے تاکہ آیندہ وہ بھی احتیاط کرے اور دوسروں کو بھی اِس سے سبق حاصل ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے اُسے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ یہ کفارہ درج ذیل ہے:

ایک لونڈی یا غلام آزاد کیا جائے۔

وہ میسر نہ ہو تو پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے جائیں۔
یہ بھی نہ ہو سکے تو ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

طلاق

میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے تو انبیا علیہم السلام کے دین میں علیحدگی کی گنجایش ہمیشہ رہی ہے۔ اصطلاح میں اِسے طلاق کہا جاتا ہے۔ اِس کی نوبت پہنچنے سے پہلے ہر شخص کی خواہش ہونی چاہیے کہ جو رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو گیا ہے، اُسے ممکن حد تک ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اصلاح کی تمام ممکن تدابیر اختیار کر لینے کے بعد بھی اگر صورت حال بہتر نہیں ہوتی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ رشتہ قائم نہ رہ سکے گا تو طلاق سے پہلے آخری تدبیر کے طور پر اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے قبیلہ، برادری اور اُن کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ اِس کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ ایک حکم میاں اور ایک بیوی کے خاندان میں سے منتخب کیا جائے اور وہ دونوں مل کر اُن میں صلح کرائیں۔ اِس سے توقع ہے کہ جس جھگڑے کو فریقین خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، وہ خاندان کے بزرگوں اور دوسرے خیر خواہوں اور ہمدردوں کی مداخلت سے طے ہو جائے۔

مرد خاندان کا سربراہ ہے، پھر نان و نفقہ اور دوسرے اخراجات کی ذمہ داری بھی اُسی پر ہے، اِس لیے طلاق کا حق بھی اُسے ہی دیا گیا ہے۔ چنانچہ عورت اگر علیحدگی چاہے تو وہ طلاق دے گی نہیں، بلکہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت عدالت سے رجوع کر سکتی ہے جو شوہر کو طلاق دینے کا حکم دے گی یا فسخ نکاح کا فیصلہ کر دے گی۔

شوہر خود طلاق دے یا بیوی کے مطالبے پر اُسے علیحدہ کر دینے کا فیصلہ کرے، دونوں ہی صورتوں میں اِس کا جو طریقہ قرآن میں بتایا گیا ہے، وہ درج ذیل ہے:

۱۔ طلاق عدت کے لحاظ سے دی جائے گی۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو فوراً علیحدہ کر دینے کے لیے طلاق دینا جائز نہیں ہے۔ یہ جب دی جائے گی، ایک متعین مدت کے پورا ہو جانے پر مفارقت کے ارادے سے دی جائے گی۔ عدت کا لفظ اصطلاح میں اُس مدت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں بیوی شوہر کی طرف سے طلاق یا اُس کی وفات کے بعد کسی دوسرے شخص سے نکاح نہیں کر سکتی۔ یہ مدت چونکہ اصلاً مقرر ہی اِس لیے کی گئی ہے کہ عورت کے

پیٹ کی صورت حال پوری طرح واضح ہو جائے، اِس لیے ضروری ہے کہ بیوی کو حیض سے فراغت کے بعد اور اُس سے زن و شو کا تعلق قائم کیے بغیر طلاق دی جائے۔

۲۔ عدت کا شمار پوری احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے۔ طلاق کا معاملہ نہایت نازک ہے، اِس سے عورت اور مرد اور اُن کی اولاد اور اُن کے خاندان کے لیے بہت سے قانونی مسائل پیدا ہوتے ہیں، اِس لیے ضروری ہے کہ جب طلاق دی جائے تو اُس کے وقت اور تاریخ کو یاد رکھا جائے اور یہ بھی یاد رکھا جائے کہ طلاق کے وقت عورت کی حالت کیا تھی، عدت کی ابتدا کس وقت ہوئی ہے، یہ کب تک باقی رہے گی اور کب ختم ہو جائے گی۔

۳۔ عدت کے پورا ہونے تک شوہر کو رجوع کا حق ہے۔ شوہر رجوع نہ کرے تو عدت کے پورا ہو جانے پر میاں بیوی کا رشتہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ خاتمے کو پہنچ رہی ہو تو شوہر کو فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اُسے بیوی کو روکنا ہے یا رخصت کر دینا ہے۔ دونوں ہی صورتوں میں اللہ کا حکم ہے کہ معاملہ معروف کے مطابق، یعنی بھلے طریقے سے کیا جائے۔ اِس باب میں جو ہدایات خود قرآن میں دی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، بیوی کو کوئی مال، جائداد، زیورات اور ملبوسات وغیرہ، خواہ کتنی ہی مالیت کے ہوں، اگر تحفے کے طور پر دیے گئے ہیں تو اُن کا واپس لینا جائز نہیں ہے۔ نان و نفقہ اور مہر تو عورت کا حق ہے، اُن کے واپس لینے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اِن کے علاوہ جو چیزیں دی گئی ہوں، اُن کے بارے میں بھی قرآن کا حکم ہے کہ وہ ہرگز واپس نہیں لی جا سکتیں۔

اِس سے دو صورتیں، البتہ مستثنیٰ ہیں:

ایک یہ کہ میاں بیوی میں حدود الٰہی کے مطابق نباہ ممکن نہ رہے، معاشرے کے ارباب حل و عقد بھی یہی محسوس کریں، لیکن میاں صرف اِس لیے طلاق دینے پر آمادہ نہ ہو کہ اُس کے دیے ہوئے اموال بھی ساتھ ہی جائیں گے تو بیوی یہ اموال یا اِن کا کچھ حصہ واپس کر کے شوہر سے طلاق لے سکتی ہے۔ اِس طرح کی صورت حال اگر کبھی پیدا ہو جائے تو شوہر کے لیے اُسے لینا ممنوع نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ بیوی کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرے۔ اِس سے میاں بیوی کے رشتے کی بنیاد ہی چونکہ منہدم ہو جاتی ہے، لہٰذا شوہر کے لیے جائز ہے کہ اِس صورت میں وہ اپنا دیا ہوا مال اُس سے واپس لے لے۔

ثانیاً، عورت کو ہاتھ لگانے اور اُس کا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دے دی جائے تو مہر کے معاملے میں شوہر پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، لیکن مہر مقرر ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق کی نوبت پہنچ جائے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا،

الاّ یہ کہ عورت اپنی مرضی سے پورا چھوڑ دے یا مرد پورا ادا کر دے۔

ثالثاً، عورت کو کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کیا جائے۔ قرآن نے اِسے اللہ سے ڈرنے والوں اور احسان کا رویہ اختیار کرنے والوں پر ایک حق قرار دیا ہے۔ اِس کی مقدار سوسائٹی کے دستور اور مرد کے معاشی حالات کی رعایت سے متعین کی جائے گی۔ طلاق اگر عورت کو ہاتھ لگائے بغیر یا مہر مقرر کیے بغیر بھی دی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ حق ادا ہونا چاہیے۔

۴۔ عدت کے دوران میں شوہر رجوع کر لے تو عورت بدستور اُس کی بیوی رہے گی۔ طلاق اور طلاق کے بعد رجوع کا یہ حق ہر شخص کو ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ حاصل ہے۔ اِس کے بعد یہ حق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک رشتۂ نکاح میں دو مرتبہ رجوع کے بعد تیسری مرتبہ پھر علیحدگی کی نوبت آ گئی اور شوہر نے طلاق دے دی تو اِس کے نتیجے میں عورت ہمیشہ کے لیے اُس سے جدا ہو جائے گی، الاّ یہ کہ اُس کا نکاح کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہو اور وہ بھی اُسے طلاق دے دے۔

۵۔ شوہر طلاق دے یا رجوع کرے، دونوں ہی صورتوں میں اُسے چاہیے کہ اپنے اِس فیصلے پر دو ثقہ مسلمانوں کو گواہ بنا لے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ فریقین میں سے کوئی بعد میں کسی بات کا انکار نہ کرے اور اگر کوئی نزاع پیدا ہو تو اُس کا فیصلہ آسانی کے ساتھ ہو جائے۔

۶۔ طلاق کی عدت عام حالات میں تین حیض اور حمل کی صورت میں وضع حمل ہے۔ عورت حیض سے مایوس ہو چکی ہو یا حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود اُسے حیض نہ آیا ہو تو یہ عدت تین مہینے ہو گی۔ عورت غیر مدخولہ ہو تو اُس کے متعلق چونکہ حمل کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اِس لیے اُس کی کوئی عدت بھی نہیں ہے۔

زمانۂ عدت کے جو احکام قرآن میں بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں:

اولاً، ہدایت کی گئی ہے کہ اِس دوران میں نہ بیوی کو اپنا گھر چھوڑنا چاہیے اور نہ شوہر کو یہ حق ہے کہ اُس کے گھر سے اُسے نکال دے۔ اِس طرح اکٹھا رہنے کے نتیجے میں توقع ہے کہ دلوں میں تبدیلی پیدا ہو جائے، دونوں اپنے رویے کا جائزہ لیں اور اُن کا اجڑتا ہوا گھر ایک مرتبہ پھر آباد ہو جائے۔ اِس سے مستثنیٰ صرف یہ صورت ہے کہ مرد نے عورت کو طلاق ہی کسی کھلی بدکاری کے ارتکاب پر دی ہو۔ اِس صورت میں، ظاہر ہے کہ نہ شوہر سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہے کہ وہ ایسی عورت کو گھر میں رہنے دے، اور نہ اِس سے وہ فائدہ ہی حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے یہ ہدایت کی گئی ہے۔

ثانیاً، فرمایا ہے کہ عدت کے دوران میں وہ عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق رہنے کی جگہ اور نان و نفقہ فراہم کرے

گا اور اِس عرصے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرے گا جس سے اُس کی خودداری مجروح ہو اور وہ چند ہی دنوں میں پریشان ہو کر اُس کا گھر چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جائے۔

ثالثاً، زمانۂ عدت میں عورت اپنا حمل چھپانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نہایت سختی کے ساتھ اِس کی تاکید فرمائی ہے، اِس لیے کہ عدت کا حکم دیا ہی اِس لیے گیا ہے کہ عورت کے حاملہ ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہو جائے۔

۷۔ طلاق کے بعد بھی اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت اُس کے بچے کو دودھ پلائے تو اُسے دو سال تک یہ ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔ عورت اِس کے لیے آمادہ ہو تو مرد اُسے اِس خدمت کا معاوضہ ادا کرے گا اور یہ معاوضہ باہمی مشورے سے اور بھلے طریقے سے طے کیا جائے گا۔ بچے کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہٖ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کے معاملے میں اُس کے وارث کی ہو گی۔ فریقین یہ مدت کم بھی کر سکتے ہیں اور بچے کا باپ یا اُس کے ورثہ ماں کی جگہ کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہیں تو اِس کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ اُس کی ماں سے دینے دلانے کی جو قرارداد ہوئی ہے، وہ پوری کر دی جائے۔

۸۔ طلاق کے بعد عورت کے کسی فیصلے میں رکاوٹ بننے کا حق پہلے شوہر کے لیے باقی نہیں رہتا۔ وہ جب چاہے اور جہاں چاہے، شادی کر سکتی ہے۔ اُس کا یہ فیصلہ اگر دستور کے مطابق ہے تو اِس پر کسی اعتراض کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

شوہر کی وفات

بیوہ کی عدت چار مہینے دس دن ہے۔ عام مطلقہ کی نسبت سے یہ اضافہ اِس لیے ہوا ہے کہ اُس کو تو ایسے طہر میں طلاق دینے کی ہدایت کی گئی ہے جس میں شوہر سے اُس کی ملاقات نہ ہوئی ہو، لیکن بیوہ کے لیے اِس طرح کا کوئی ضابطہ بنانا چونکہ ممکن نہیں ہے، اِس لیے احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ دن بڑھا دیے جاتے۔

مطلقہ اور بیوہ کے لیے عدت کا حکم چونکہ ایک ہی مقصد سے دیا گیا ہے، اِس لیے جو مستثنیات طلاق کے لیے بیان ہوئے ہیں، وہ بیوہ کی عدت میں بھی اِسی طرح ملحوظ ہوں گے۔ چنانچہ بیوہ غیر مدخولہ کے لیے کوئی عدت نہیں ہو گی اور حاملہ کی عدت وضع حمل کے بعد ختم ہو جائے گی۔

عدت گزرنے کے بعد عورت آزاد ہے اور اپنے معاملے میں جو قدم مناسب سمجھے، اٹھا سکتی ہے۔ معاشرے کے دستور کی پابندی، البتہ اُسے کرنی چاہیے، یعنی کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے متعلق خاندانوں کی عزت، شہرت، وجاہت اور اچھی روایات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ یہ ملحوظ رہے تو اُس پر یا اُس کے اولیا پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کرنا چاہتا ہو تو عدت کے دوران میں وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنے دل میں اُس کا ارادہ کر لے یا اشارے کنایے میں کوئی بات منہ سے نکال دے، لیکن اُس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے کہ ایک غم زدہ خاندان کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر عورت کو نکاح کا پیغام بھیجے یا کوئی خفیہ عہد و پیمان کرے۔

شوہروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیواؤں کے لیے ایک سال کے نان و نفقہ اور اپنے گھروں میں سکونت کی وصیت کر جائیں، الّا یہ کہ وہ خود اپنی مرضی سے شوہر کا گھر چھوڑ دیں یا اِس نوعیت کا کوئی دوسرا اقدام اٹھا لیں۔

مرد و زن کا اختلاط

نکاح کے ادارے کی حفاظت اور باہمی تعلقات میں دلوں کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اختلاط مرد و زن کے آداب مقرر فرمائے ہیں۔

یہ آداب درج ذیل ہیں:

۱۔ ایک دوسرے کے گھروں میں جانے کی ضرورت پیش آ جائے تو بے دھڑک اور بے پوچھے اندر داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ اِس طرح کے موقعوں پر ضروری ہے کہ آدمی پہلے گھر والوں کو اپنا تعارف کرائے، جس کا شایستہ اور مہذب طریقہ یہ ہے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر سلام کیا جائے۔ اِس سے گھر والے معلوم کر لیں گے کہ آنے والا کون ہے، کیا چاہتا ہے اور اُس کا گھر میں داخل ہونا مناسب ہے یا نہیں۔ اِس کے بعد اگر وہ سلام کا جواب دیں اور اجازت ملے تو گھر میں داخل ہو، اجازت دینے کے لیے گھر میں کوئی موجود نہ ہو یا موجود ہو اور اُس کی طرف سے کہہ دیا جائے کہ اِس وقت ملنا ممکن نہیں ہے تو دل میں کوئی تنگی محسوس کیے بغیر واپس چلا جائے۔

اِس سے ربط و تعلق کے لوگوں کو سہارے سے محروم کرنا یا اُن کی سوشل آزادیوں پر پابندی لگانا مقصود نہیں ہے، اِس لیے لوگ خود ہوں یا اُن کے مجبور و معذور اعزہ و احباب جو اُنھی کے گھروں پر گزارہ کرتے ہیں، اُن کے لیے کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے کے گھروں میں آئیں جائیں، ملیں جلیں اور مرد و عورت الگ الگ یا اکٹھے بیٹھ کر کھائیں پئیں، نہ اُن کے اپنے گھروں میں کوئی حرج ہے، نہ باپ دادا کے گھروں میں، نہ ماؤں کے گھروں میں، نہ بھائیوں اور بہنوں کے گھروں میں، نہ چچاؤں، پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کے گھروں میں، نہ زیر تولیت افراد کے گھروں میں اور نہ دوستوں کے گھروں میں۔ اتنی بات، البتہ ضروری ہے کہ گھروں میں داخل ہوں تو اپنے لوگوں کو سلام کریں۔

۲۔ اُن جگہوں کے لیے یہ پابندی ضروری نہیں ہے جہاں لوگوں کے بیوی بچے نہ رہتے ہوں۔ یعنی ہوٹل، سرائے، مہمان خانے، دکانیں، دفاتر، مردانہ نشست گاہیں وغیرہ۔ اِسی طرح گھروں میں آمد و رفت رکھنے والے خادموں اور نابالغ بچوں کے لیے بھی ہر موقع پر اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔ اُن کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ تین اوقات میں اجازت لے کر داخل ہوں: نماز فجر سے پہلے جبکہ لوگ ابھی بستروں میں ہوتے ہیں؛ ظہر کے وقت جب وہ قیلولہ کے لیے کپڑے اتار کر رکھ دیتے ہیں اور عشا کے بعد جب وہ سونے کے لیے بستروں میں چلے جاتے ہیں۔ اِن کے سوا دوسرے اوقات میں نابالغ بچے اور گھر کے خدام عورتوں اور مردوں کے پاس، اُن کے تخلیے کی جگہوں میں اور اُن کے کمروں میں اجازت لیے بغیر آ سکتے ہیں۔ نابالغ بچوں کے لیے، البتہ بالغ ہو جانے کے بعد یہ رخصت باقی نہ رہے گی۔ بلوغ کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد اُن کے لیے بھی ضروری ہوگا کہ عام قانون کے مطابق اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوں۔

۳۔ اِن مقامات پر اگر عورتیں موجود ہوں تو اللہ کا حکم ہے کہ مرد بھی اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور عورتیں بھی۔ نگاہوں میں حیا ہو اور مرد و عورت ایک دوسرے کے حسن و جمال سے آنکھیں سینکنے، خط و خال کا جائزہ لینے اور ایک دوسرے کو گھورنے سے پرہیز کریں تو اِس حکم کا منشا یقیناً پورا ہو جاتا ہے، اِس لیے کہ اِس سے مقصود نہ دیکھنا یا ہر وقت نیچے ہی دیکھتے رہنا نہیں ہے، بلکہ نگاہ بھر کر نہ دیکھنا اور نگاہوں کو دیکھنے کے لیے بالکل آزاد نہ چھوڑ دینا ہے۔

۴۔ اِس طرح کے موقعوں پر شرم گاہوں کی حفاظت کی جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نہ اُن کے اندر دوسروں کے لیے کوئی میلان ہو اور نہ وہ اُن کے سامنے کھولی جائیں، بلکہ عورتیں اور مرد ایک جگہ موجود ہوں تو چھپانے کی جگہوں کو اور بھی زیادہ اہتمام کے ساتھ چھپا کر رکھا جائے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ بڑا دخل اِس چیز کو ہے کہ لباس با قرینہ ہو۔ عورتیں اور مرد، دونوں ایسا لباس پہنیں جو زینت کے ساتھ صنفی اعضا کو بھی پوری طرح چھپانے والا ہو۔ پھر ملاقات کے موقع پر اِس بات کا خیال رکھا جائے کہ اٹھنے بیٹھنے میں کوئی شخص برہنہ نہ ہونے پائے۔

۵۔ عورتوں کے لیے بالخصوص ضروری ہے کہ وہ زیب و زینت کی کوئی چیز اپنے محرم اعزہ اور متعلقین کے سوا کسی شخص کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیں۔ اِس سے زیبایش کی وہ چیزیں، البتہ مستثنیٰ ہیں جو عادتاً کھلی ہوتی ہیں۔ یعنی ہاتھ پاؤں اور چہرے کا بناؤ سنگھار اور زیورات وغیرہ۔ اِن اعضا کے سوا باقی ہر جگہ کی زیبایش عورتوں کو چھپا کر رکھنی چاہیے، یہاں تک کہ مردوں کی موجودگی میں اپنے پاؤں زمین پر مار کر چلنے سے بھی پرہیز کرنا چاہیے تاکہ اُن کی چھپی ہوئی زینت ظاہر نہ ہو جائے۔

۶۔ عورت کا سینہ بھی چونکہ صنفی اعضا میں سے ہے، پھر گلے میں زیورات بھی ہوتے ہیں، اِس لیے اِس طرح کے

موقعوں پر اِسے دوپٹے سے ڈھانپ لینا چاہیے۔ سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا یہ حکم اُن بڑی بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو اب نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، بشرطیکہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ تاہم پسندیدہ بات اُن کے لیے بھی یہی ہے کہ احتیاط کریں اور مردوں کی موجودگی میں دوپٹا نہ اتاریں۔ یہ اُن کے لیے بہتر ہے۔

والدین

نکاح سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں، اُن میں اہم ترین رشتہ والدین کا ہے۔ اِن کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم تمام الہامی صحائف میں دی گئی ہے۔ اِس کے جو حدود قرآن نے متعین فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اپنے پروردگار کے بعد انسان کو سب سے بڑھ کر اپنے ماں باپ کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ یہ شکر محض زبان سے ادا نہیں ہوتا، اِس کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی اُن کے ساتھ انتہائی احترام سے پیش آئے، اُن کے خلاف دل میں کوئی بے زاری نہ پیدا ہونے دے، اُن کے سامنے سوءِ ادب کا کوئی کلمہ زبان سے نہ نکالے، بلکہ نرمی، محبت، شرافت اور سعادت مندی کا اسلوب اختیار کرے۔ اُن کی بات مانے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں میں اُن کی دل داری اور تسلی کرتا رہے۔

۲۔ والدین کی اِس حیثیت کے باوجود یہ حق اُن کو حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنانے کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں۔ اِس معاملے میں اولاد کو اُن کی اطاعت سے صاف انکار کر دینا چاہیے اور پیروی ہر حال میں اُنھی لوگوں کے طریقے کی کرنی چاہیے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں۔ خدا سے انحراف کی دعوت والدین بھی دیں تو قبول نہیں کی جا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام و ہدایات بھی اِسی کے تحت سمجھے جائیں گے اور والدین کے کہنے سے اُن کی خلاف ورزی بھی کسی کے لیے جائز نہ ہو گی۔

۳۔ شرک جیسے گناہ پر اصرار کے باوجود دنیا کے معاملات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ دستور کے مطابق اِسی طرح قائم رہنا چاہیے۔ اُن کی ضروریات حتی المقدور پوری کرنے کی کوشش کی جائے اور اُن کے لیے ہدایت کی دعا بھی برابر جاری رہے۔ دین و شریعت کا معاملہ الگ ہے، مگر اِس طرح کی چیزوں میں اولاد سے ہرگز کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

یتامیٰ

بچے باپ سے محروم ہو جائیں تو اُن کے معاملات سے متعلق چند متعین ہدایات قرآن میں دی گئی ہیں، اِن کا

خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ یتیموں کے سرپرست اُن کا مال اُن کے حوالے کریں، اُسے خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ظلم و ناانصافی سے یتیم کا مال ہڑپ کرنا گویا اپنے پیٹ میں آگ بھرنا ہے۔ لہٰذا کوئی شخص نہ اپنا برا مال اُن کے اچھے مال سے بدلنے کی کوشش کرے اور نہ انتظامی سہولت کی نمایش کر کے اُس کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر کھانے کے مواقع پیدا کرے۔ اِس طرح کا اختلاط اگر کسی وقت کیا جائے تو یہ خورد برد کے لیے نہیں، بلکہ اُن کی بہبود اور اُن کے معاملات کی اصلاح کے لیے ہونا چاہیے۔

۲۔ یتیموں کے مال کی حفاظت اور اُن کے حقوق کی نگہداشت ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کے لیے تنہا اِس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو اور وہ یہ سمجھتے ہوں کہ یتیم کی ماں کو اُس میں شامل کر کے وہ اپنے لیے سہولت پیدا کر سکتے ہیں تو اُنھیں چاہیے کہ اُن کی ماؤں میں سے جو اُن کے لیے جائز ہوں، اُن میں سے دو دو، تین تین، چار چار کے ساتھ نکاح کر لیں۔ لیکن یہ اجازت صرف اُس صورت میں ہے، جب بیویوں کے درمیان عدل قائم رکھنا ممکن ہو۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ وہ اِس میں کامیاب نہ ہو سکیں گے تو پھر یتیموں کی بہبود جیسے نیک مقصد کے لیے بھی ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں۔ انصاف پر قائم رہنے کے لیے یہی طریقہ زیادہ صحیح ہے۔ اِس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اِن عورتوں کا مہر اُسی طریقے سے دیا جائے جس طرح عام عورتوں کو دیا جاتا ہے۔ یہ عذر نہیں پیدا کرنا چاہیے کہ نکاح چونکہ اُنھی کی اولاد کی مصلحت سے کیا گیا ہے، اِس لیے اب کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہی۔ ہاں، اگر اپنی خوشی سے وہ مہر کا کوئی حصہ معاف کر دیں یا کوئی اور رعایت کریں تو اِس میں حرج نہیں ہے۔ لوگ اگر چاہیں تو اُس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ یتیموں کا مال اُن کے حوالے کر دینے کی جو ہدایت کی گئی ہے، اُس پر عمل اُسی وقت کیا جائے، جب وہ اپنا مال سنبھال لینے کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اِس سے پہلے ضروری ہے کہ یہ سرپرستوں کی حفاظت اور نگرانی میں رہے اور وہ یتیموں کو جانچتے رہیں کہ اُن کے اندر معاملات کی سوجھ بوجھ اور اپنی ذمہ داریوں کو اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو رہی ہے یا نہیں۔ اِس دوران میں اُن کی ضروریات، البتہ فراخی کے ساتھ پوری کی جائیں۔ اِس اندیشے سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے، اُن کا مال جلدی جلدی اڑانے کی کوشش نہ کی جائے اور بات چیت میں اُن کی دل داری کا خیال رکھا جائے۔

۴۔ سرپرست اگر مستغنی ہو تو اپنی اِس خدمت کے عوض اُسے کچھ لینا نہیں چاہیے، لیکن غریب ہو تو یتیم کے مال سے اپنا حق خدمت دستور کے مطابق لے سکتا ہے۔

۵۔ مال حوالے کیا جائے تو اُس پر کچھ ثقہ اور معتبر لوگوں کو گواہ بنا لینا چاہیے تاکہ کسی سوءظن اور اختلاف و نزاع کا احتمال باقی نہ رہے۔ پھر یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن یہی حساب اللہ تعالیٰ کو بھی دینا ہے اور وہ سمیع و علیم ہے، اُس سے کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکتی۔

٦۔ مرنے والے کے ترکے میں وارثوں کے حصے اگرچہ متعین ہیں، لیکن تقسیم وراثت کے موقع پر قریبی اعزہ اور یتامیٰ و مساکین آ جائیں تو اِس سے قطع نظر کہ قانونی لحاظ سے اُن کا کوئی حق بنتا ہے یا نہیں، اُنھیں کچھ دے دلا کر اور اچھی بات کہہ کر رخصت کرنا چاہیے۔ اِس طرح کے موقعوں پر یہ بات ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ اُس کے بچے بھی یتیم ہو سکتے ہیں اور وہ بھی اِسی طرح اُنھیں دوسروں کی نگاہ التفات کا محتاج چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو سکتا ہے۔

طالب محسن

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ جناب جاوید احمد غامدی کے تلامذہ ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ یہاں ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

یتیم پوتوں کی وراثت

سوال: ہم چار بھائی اور چار بہنیں ہیں۔ میری بڑی بہن (نسرین) آٹھ سال کی عمر میں ۱۹۴۶ء میں فوت ہو گئیں۔ میری والدہ ۵۷ سال کی عمر میں ۱۹۷۷ء میں فوت ہوئیں۔ میرے بڑے بھائی ۵۶ سال کی عمر میں ۱۹۹۵ء میں فوت ہوئے۔ اب میرے والد ۹۳ سال کی عمر میں مئی ۲۰۰۶ میں فوت ہو گئے ہیں۔ میرے مرحوم بھائی اپنے پیچھے ایک بیوہ (سلیمہ) اور دو بیٹے سلمان (۳۵) سال اور عدنان (۳۰) سال چھوڑ گئے ہیں۔ سلمان اور عدنان، دونوں شادی شدہ ہیں۔ انجینئر ہیں اور یو۔ایس۔اے میں اچھی تنخواہ لے رہے ہیں۔ خالد کی بیوہ کراچی میں ہیں۔ ایک اچھے فلیٹ کی مالک ہیں اور ان کے پاس گزر اوقات کے لیے کافی بچتیں بھی ہیں۔ بیٹے بھی ان کو پیسے بھیجتے رہتے ہیں۔

میرا سوال یہ ہے کہ کیا سلیمہ، سلمان اور عدنان کا میرے باپ کی جائداد میں حصہ ہے اور اگر ہے تو کتنا؟

(شاہد افضال)

جواب: آپ کا سوال سادہ لفظوں میں یہ ہے کہ جو بیٹا والد کی موجودگی میں فوت ہو جائے کیا اس کی اولاد دادا

کی وراثت کی حق دار ہے؟

قرآن مجید میں جب وراثت کا حکم بیان ہوا تو اس میں اولاد، والدین، بیوی، شوہر اور بہن بھائیوں کے حصے بیان ہوئے ہیں۔ ان حصوں کو بیان کرنے کے لیے انھی الفاظ کے عربی مترادفات آئے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ یتیم پوتے کی وارثت کا براہ راست ذکر نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک، اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ یہ پوتا اپنے والد کے حصے کا حق دار نہ ہو۔ آپ نے جو صورت حال لکھی ہے، اس سے غالباً آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انھیں وراثت کے اس مال کی ضرورت نہیں ہے۔ یا آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ باقی لوگ ان کے مقابلے میں زیادہ مستحق ہیں۔ معاملہ کچھ بھی ہو اس سے قانون وراثت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک آپ کے بھتیجے اور بھابھی آپ کے والد کی وراثت میں اپنے والد، یعنی آپ کے بھائی کے حصے کے حق دار ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی تفصیل کے مطابق چار بھائی اور تین بہنیں وارث ہیں۔ جائداد گیارہ حصوں میں تقسیم ہوگی۔ ہر بھائی کو دو حصے اور ہر بہن کو ایک حصہ ملے گا۔ مراد یہ کہ اگر ترکہ ٦٦ روپے ہو تو بھائیوں کو ١٢، ١٢ روپے اور بہنوں کو ٦، ٦ روپے دیے جائیں گے (١٢+١٢+١٢+١٢+ ٦+٦+٦=٦٦)۔ مرحوم بھائی کے ١٢ روپے ان کی بیوہ اور بیٹوں کو ان کے حصوں کے مطابق دیے جائیں گے۔ یعنی آپ کی بھابھی سلیمہ کو ٢ روپے اور سلمان اور عدنان کو ٥، ٥ روپے ادا کیے جائیں گے۔

عورت کا نماز کا لباس

سوال: میری بیوی اس خیال کے تحت کہ نماز کے لیے بازو کہنی تک ڈھانپنا کافی ہے، نماز پڑھتی رہی ہے۔ اسے کسی نے بتایا ہے کہ عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز میں کلائیاں بھی ڈھانپے۔ مجھے ان دونوں آرا کا استدلال معلوم نہیں ہے۔ براہ کرم رہنمائی فرمایئے۔ (عامر شہزاد)

جواب: فقہا کے نزدیک بحث کا انحصار ستر کے تعین پر ہے۔ نماز میں نمازی کے لیے ستر ڈھانپنا واجب ہے۔ عورت اور مرد کے ستر میں فرق ہے۔ عام فقہا کے نزدیک عورت کا ستر ہاتھ اور چہرہ چھوڑ کر باقی سارا جسم ہے۔ وہ قرآن مجید کی آیت 'و لا یبدین زینتھن الا ما ظھر' (عورتیں اپنی زینتیں ظاہر نہ کریں سوائے ان کے جو آپ سے آپ ظاہر ہوں) سے استدلال کرتے ہیں۔ 'الا ما ظھر' کا اطلاق ان کے نزدیک ہاتھوں اور چہرے پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ. ''ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنے لباس پہنو۔''

(الاعراف ۷:۳۱)

مولانا امین احسن اصلاحی نے ''تدبر قرآن'' میں اس ارشاد کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''خذوا زينتكم' میں زینت سے مراد لباس فاخرہ نہیں، بلکہ مجرد لباس ہے۔ لباس کو زینت کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہاں یہ ہے کہ طواف میں عریانی اختیار کرنے کا فلسفہ یہی تراشا گیا تھا کہ لباس زیب و زینت میں داخل ہے اور زیب و زینت اس عبادت کے شایان شان نہیں ہے۔ حج اور احرام میں فی الجملہ زہد و درویشی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے چلی آ رہی ہے اور یہ حج کی خصوصیات میں سے ہے۔ لیکن عربوں نے دور جاہلیت میں جہاں اور بہت سی بدعات ایجاد کیں وہیں، یہ بدعت بھی ایجاد کر ڈالی کہ احرام کی سادگی اور درویشی کو عورتوں اور مردوں، سب کے لیے عریانی کی حد تک پہنچا دیا۔ قرآن نے اسی بدعت کی اصلاح کی۔ فرمایا کہ یہ عریانی بے حیائی ہے۔ اپنے لباس ہر مسجد کی حاضری کے وقت پہنو۔ جس طرح کوئی مسجد غیر اللہ کے لیے نہیں ہو سکتی اسی طرح کوئی مسجد ایسی نہیں ہو سکتی جس کی حاضری کے لیے یہ شرط ٹھہرا لی جائے کہ آدمی وہاں کپڑے اتار کر حاضر ہو۔ 'كل مسجد' فرما کر اس حکم کو عام کر دیا کہ حرم اور غیر حرم کی تخصیص نہ رہ جائے۔ یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ ٹھہراتی ہے۔'' (۳/۲۵۱)

اس ہدایت سے معلوم ہوا کہ نماز میں لباس پہنا جائے گا۔ برہنہ نماز ادا کرنا درست نہیں ہے۔ لیکن اس سے ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ یہ لباس کم از کم کتنا ہو۔ البتہ روایات میں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ مردوں کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه و سلم قال: لا يصلی احدكم فی الثوب الواحد ليس علی عاتقيه منه شئ. (مسلم، رقم ۲۹۹۵)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی ایک کپڑے میں اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھوں پر کوئی چیز نہ ہو۔''

عورتوں کے ضمن میں آپ نے فرمایا:

عن عائشة رضی الله عنها عن النبی صلی الله عليه و سلم انه قال: لا يقبل الله صلوٰة حائض الا بخمار.

(ابوداؤد، رقم ۵۱۶)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ دوپٹے کے بغیر بالغ عورت کی نماز قبول نہیں کرتے۔''

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے:

عن ام سلمة رضی اللّٰہ عنھا انھا سألت النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم أتصلی المرأة فی درع و خمار لیس علیھا أزار؟ قال: إذا کان الدرع سابغا یغطی ظھور قدمیھا. (ابوداؤد، رقم ۶۴۰)

''حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا عورت قمیص اور دوپٹے کے ساتھ نماز پڑھ سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا: صرف اس صورت میں جب لمبی قمیص نے پاؤں کی پشت کو ڈھانپا ہوا ہو۔''

ان روایات سے وہ کم از کم اہتمام معلوم ہوتا ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں ملحوظ رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ استاد محترم نے ان ساری تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے نماز کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شایستہ اور مناسب لباس پہن کر نماز پڑھے۔'' (قانون عبادات ۸۶)

اس تفصیل سے واضح ہے کہ آپ کی اہلیہ کی نماز کے ادا ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے فقہا کا رجحان یہ ہے کہ جس لباس اور جس اخفاے زینت کا تقاضا اللہ تعالیٰ نے مردوں کے سامنے آنے پر کیا ہے، وہی اہتمام نماز میں بھی ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے۔ یہ بات لازم تو نہیں کی جاسکتی، لیکن اگر اس کا اہتمام کیا جائے تو یقیناً پسندیدہ ہوگا۔

رؤیت ہلال کا لزوم

سوال: پچھلے دنوں مجھے کسی نے جاوید احمد صاحب غامدی کی یہ رائے بتائی کہ اب ''اسلامی مہینوں کے تعین کے لیے چاند دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ چاند کی مختلف اوقات میں مختلف حالتیں مشینوں کے ذریعے سے ہم پر عیاں ہیں۔'' براہ کرم واضح فرمائیے کہ عید کم از کم ایک ملک میں اور زیادہ سے زیادہ عالم اسلام میں ایک دن میں کیسے کی جائے۔ نیز اختلاف مطالع کے باعث ہوائی سفر میں نماز اور روزہ کے اوقات کا حساب کیسے کیا جائے؟ (فریدہ یوسف)

جواب: قرآن مجید میں رمضان میں روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی طے ہے کہ روزے اور حج کے مہینے قمری تقویم، یعنی چاند کی ماہانہ گردش سے طے ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قمری مہینے کا تعین کیسے ہو۔ سامنے کی بات یہ ہے کہ یہ کام چاند دیکھ کر کیا جائے گا۔ لیکن انسان نے بہت پہلے یہ بات جان لی تھی کہ

چاند کی گردش معین ہے اور ہلال کے طلوع کو حساب کتاب سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ قمری مہینے کے ہونے اور نہ ہونے کا تعین دونوں طریقوں سے ممکن ہے۔ رؤیت ہلال سے بھی اور گردش قمر کے حساب سے بھی۔ اب یہ حساب کتاب اتنا یقینی ہو چکا ہے کہ اہل فن سیکنڈ کے حساب سے چاند کے طلوع ہونے کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا دین میں چاند کے تعین میں کسی خاص طریقے کو ترجیح دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اس حوالے سے کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ چنانچہ مدار بحث ایک روایت ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

صوموا لرؤیته وافطروا لرؤیته فان غمی علیکم فأکملوا العدد.

''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو۔ اگر مطلع صاف نہ ہو تو گنتی پوری کرو۔''

(مسلم، رقم ۱۰۸۱)

اس روایت کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ رمضان اور عید کا تعین صرف چاند دیکھ کر کرنا چاہیے۔ دراں حالیکہ یہ بات اس جملے سے لازم نہیں آتی۔ روزے کے حوالے سے سحری اور افطار کا تعین بھی طلوع فجر اور غروب آفتاب سے متعلق ہے۔ لیکن وہاں ہم نے کسی رؤیت صبح صادق اور تعین غروب آفتاب کا اہتمام نہیں کیا۔ سورج کی گردش کے متعین حساب کتاب کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے اوقات متعین کر دیے گئے ہیں اور لوگ گھڑیاں دیکھ کر سحر اور افطار کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید نے یہاں بھی دو مظاہر فطرت کو آغاز صوم اور اختتام صوم کا نشان قرار دیا تھا۔ استاد محترم کے نزدیک جس طرح یہاں سورج کی گردش کے حساب پر اعتماد کیا گیا ہے اسی طرح چاند کی گردش کے حساب پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا منشا اس صورت میں بھی بتمام وکمال پورا ہوتا ہے۔

قدیم علما بھی جب مطلع صاف نہ ہو اور رؤیت ممکن نہ رہے تو حساب کتاب ہی کو فیصلے کا مدار قرار دیتے ہیں۔ اس باب میں دو آرا ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ شعبان کے تیس دن پورے کیے جائیں گے اور دوسری رائے یہ ہے کہ گردش کا حساب دیکھ کر طے کیا جائے کہ آج طلوع ہلال ممکن تھا یا نہیں۔ جو رائے قائم ہو اس پر عمل ہونا چاہیے۔ یہ دوسری رائے امام شافعی سے بھی مروی ہے۔ اس رائے میں بھی بنیادی اصول یہی کارفرما ہے کہ اصل مسئلہ آغاز رمضان یا اختتام رمضان کا تعین ہے۔ رؤیت ہلال اس کا ذریعہ ہے، اس کی شرط نہیں ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اختلاف مطالع کے باعث مختلف علاقوں میں عید اور رمضان کے اوقات بدل جاتے ہیں۔ اس کا کیا حل ہے؟ ہمارے نزدیک سارے عالم اسلام یا سارے ملک میں ایک ہی دن عید کرنے کی کوئی دینی وجہ نہیں

ہے۔جن علاقوں کا مطلع مختلف ہے، ان میں عید کا دن مختلف ہی ہونا چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ نے قمری گردش کو مذہبی تقویم قرار دیا ہے تو یہ فرق اسی کا نتیجہ ہے۔

ہوائی سفر میں نماز اور روزے کا حساب ایک اجتہادی معاملہ ہے۔ جس علاقے سے سفر شروع کیا گیا ہے۔ وقت کا فرق کم ہو تو اس علاقے کے اوقات ملحوظ رکھنے چاہییں۔ لیکن اگر فرق زیادہ ہو تو جس علاقے سے جہاز گزر رہا ہو یا پہنچنے والا ہو، اس کا اعتبار بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ مسافر کی صواب دید پر ہے، وہ جسے بھی اختیار کرے گا امید یہی ہے کہ اس کے روزے اور نماز کے مقبول ہونے میں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

ذوق مطالعہ

سوال: ذوق مطالعہ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ مطالعہ کس طریقے سے کرنا چاہیے۔ مطالعہ کے بعد مطالعہ شدہ باتیں کیسے یاد رکھتے ہیں۔ ایک فارغ التحصیل عالم کے لیے درس نظامی کے علاوہ آج کے دور کے جدید تقاضوں کے مطابق کن کن چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہیے؟ (سید عنایت اللہ شاہ ہاشمی)

جواب: مولانا امین احسن اصلاحی کے استاد جناب مولانا حمید الدین فراہی اپنے شاگردوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ ہمیشہ اعلیٰ کتابیں پڑھنی چاہییں۔ اعلیٰ کتابیں ہی مطالعے کا صحیح ذوق پیدا کرتی ہیں۔ کتابوں کی بھی دو سطحیں ہوتی ہیں اور طالب مطالعہ کے بھی دو درجے ہوتے ہیں: ایک وہ دور ہوتا ہے جب ایک پڑھنے لکھنے والا آدمی ہر فن کی واجبی واقفیت حاصل کرتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اس فن کے ماہرین سے پوچھ لے کہ اس ضرورت کو پورا کرنے والی کتاب کون سی ہے۔ آدمی کو اس مرحلے میں اسی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جب آدمی اس مرحلے سے گزر جائے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ فن اس کی دل چسپی کا ہے یا نہیں۔ اگر اس کی دل چسپی کا ہو تو اسے اس فن کی اعلیٰ کتابوں میں سے کسی ایک جامع کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس کی مشکلات کو سمجھنے کے لیے اس فن کے کسی استاد سے رابطہ رکھنا چاہیے۔ ایک مذہبی عالم کو نیچرل سائنس کی چیزوں سے اتنا واقف ضرور ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے فنون میں ان کے حوالے سے آنے والی بات کو سمجھ سکے۔ لیکن اسے معیشت، معاشرت، تاریخ، قانون، تہذیب و تمدن، فلسفہ، نفسیات وغیرہ تمام انسانی علوم سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ بطور خاص وہ علوم جو جدید انسان کی سوچ اور طرز زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ ان کی اچھی واقفیت کے بغیر دین کی دعوت اور دین کے دفاع کا کام کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

اس سلسلے میں آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ انسان کو اپنی صلاحیت کی سطح، اپنی طبیعت کے رجحان اور اپنے ماحول کے داعیات کو سامنے رکھ کر اپنے لیے لائحۂ عمل بنانا چاہیے۔ یہ سب خدا کے فیصلے ہیں اور انھی پر راضی ہونا بندے کے شایان شان ہے۔ ان کے ساتھ لڑائی ایک تو آدمی کو نتائج سے محروم کر دیتی ہے اور دوسرے خود اس کی اخلاقی شخصیت کے لیے ضرر کا باعث بنتی ہے۔

باقی رہا پڑھی ہوئی باتوں کا یاد رہنا تو اس کا تعلق یادداشت کی قوت اور اس علم سے واسطہ پڑتے رہنے سے ہے۔ اس کے لیے کسی اضافی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ جب کسی کتاب سے گزر جاتے ہیں تو اس میں بیان کردہ باتوں کا ایک تاثر آپ کو ذہن میں ضرور قائم رہتا ہے۔ جب کبھی ضرورت پڑے تو تفصیلی معلومات کو آدمی دوبارہ تازہ کر لیتا ہے۔

کمزور روایات سے استدلال کی وجہ

سوال: اگر بخاری شریف اور مسلم شریف کی احادیث قطعی ہیں تو صحیح اور مرفوع احادیث سے تمام اختلافی مسائل کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ثابت ہے۔ دوسری متضاد صورت کے ثبوت کے لیے غیر صحیح، موقوف اور مقطوع احادیث سے استدلال کی کیا ضرورت ہے؟ (پرویز قادر)

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کے سوال میں جو دو بنیادی مقدمات بیان ہوئے ہیں۔ وہ مقدمات درست نہیں ہیں۔ پہلا یہ کہ بخاری اور مسلم کی تمام احادیث قطعی ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان سے تمام اختلافی مسائل کا ایک ہی حل ملتا ہے۔ چنانچہ ان مقدمات کے نتیجے پر مبنی آپ کا سوال اصلاً کوئی بنیاد نہیں رکھتا۔ وہ لوگ جو احادیث کو بنیادی ماخذ کی حیثیت دیتے ہیں، وہ بھی اصولاً صحیح حدیث ہی کو اصل کی حیثیت دیتے ہیں۔ موقوف، مقطوع اور ضعیف احادیث کو تائید کے طور پر ہی لایا جاتا ہے۔ البتہ عملاً اس سے انحراف بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کی اس کوتاہی پر اپنے سوال میں تنقید کرنا چاہتے ہیں تو یہ تنقید ٹھیک ہے، لیکن یہ اصل بحث نہیں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ پہلے اصول و مبادی کی متعلقہ بحثیں سمجھ لیں، اس سے آپ کو واضح ہو جائے گا کہ اس معاملے میں بنیادی بات کیا ہے۔

احادیث میں نطق، حکمت اور ذکر کی وضاحت

سوال: اگر قرآن کے معنی مراد بتانا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری ہے تو نجم، نمل، احزاب، بقرہ، آل عمران اور جمعہ میں نطق، ذکر اور حکمت کے معانی کس کس مرفوع حدیث سے ثابت ہیں؟

(پرویز قادر)

جواب: بنیادی بات تو یہ ہے کہ روایات میں قرآن مجید کے الفاظ کی شرح یا تفسیر کی بہت ہی کم چیزیں نقل ہوئی ہیں۔ جو الفاظ آپ نے لکھے ہیں، ان کے معنی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قول منقول نہیں ہے۔ حکمت کا لفظ حدیثوں میں دانائی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور یہ اس کے معروف لغوی معنی ہیں۔ اسی طرح نطق اور ذکر کے حوالے سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی تفسیری قول موجود نہیں ہے۔ حدیثوں میں یہ لفظ بھی اپنے عام لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے قرآن مجید کی محولہ آیات کے معنی طے کرنے میں براہ راست کوئی مدد نہیں ملتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آپ احادیث سے یہ معنی کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لفظ عربی زبان کے معروف الفاظ ہیں اور سیاق وسباق کی روشنی میں ان کا اطلاق بھی بآسانی واضح ہے۔ باقی رہے امت میں ان کے حوالے سے مباحث تو وہ قرآن میں کسی مشکل کی وجہ سے نہیں ہیں۔ حدیث کی اہمیت کی بحث میں یہ آیات بھی مدار استدلال بنی ہیں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ان کے معنی میں وہ پہلو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کافی بعید ہیں۔
